# مقدمه

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰہ اللّٰہ فی القرآن لا یسبقکم بالعمل به غیر کم۔
قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ دوسرے اس پر عمل کرنے میں تم پر سبقت لے جائیں۔ (حضرت علی علیہ السلام)[1]

# آغاز سخن

الٰہیاتی تصور کائنات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبث خلق نہیں فرمایا بلکہ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے پیدا کیا اور اس مقصد تک پہنچانے کے لیے انسان کو ارتقا و تکامل کے طویل مراحل سے گزارنا بھی سنت الٰہیہ رہی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ یوم میں خلق فرمایا اور چار یوم میں اس نے زمین کو انسان کے لیے قابل سکونت بنایا اور وسائل حیات پیدا کیے۔

وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝[2]

اور اسی نے چار دنوں میں حاجتمندوں کی ضروریات کے مطابق زمین میں سامان خوراک مقرر کیا۔

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے یوم ہمارے دنوں سے مختلف ہیں:

وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝[3]

اور آپ کے پروردگار کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے مطابق یقیناً ہزار برس کی طرح ہے۔

ہر چند اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کو دفعتاً درجہ کمال تک پہنچا سکتا ہے لیکن حکمت الٰہیہ کا تقاضا یہ ہے کہ ارتقا و تکامل کا یہ عمل تدریجاً ہو۔ چنانچہ زمین کو چار مرحلوں میں قابل سکونت بنایا گیا۔

---

[1] نہج البلاغۃ وصیت ۴۷ ص ۷۳۸ [2] ۴۱ فصلت: ۱۰ [3] ۲۲ حج: ۴۷

جب تکامل و ارتقا کے مختلف مراحل سے گزر کر انسان کی مادی ترقی احسن تقویم کی منزل تک پہنچ گئی تو اگلے مرحلے میں وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ...[1] سے انسان کا فکری ارتقا شروع ہوا۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے ساتھ ہی اولاد آدم (ع) کی تعلیم و تربیت کے لیے ابتدائی درسگاہ کھول دی گئی اور نظام حیات کی ابجد سے درس شروع ہو گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں پہلی بار شریعت کی تدوین ہوئی۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا[2] — اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔

پھر عصر خلیل علیہ السلام میں ملت اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی گئی:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ...[3] — یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

عصر کلیم علیہ السلام میں انسانیت نے ایک اور اہم ارتقائی مرحلہ طے کیا اور امت کلیمی پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پوری ہو گئیں۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً ...[4] — پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تاکہ نیکی کرنے والے پر اپنی نعمت پوری کر دیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل بیان ہو اور ہدایت اور رحمت (کا باعث) ہو۔

لیکن عصر کلیم (ع) کے انسان میں شعور و ادراک کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک بچھڑے کو خدا ماننے پر آمادہ تھا۔

عصر مسیح علیہ السلام میں انسانیت کی اس تربیت گاہ کو خداوند عالم نے شریعت عیسوی کے ذریعے مزید وسعت دی اور انسانی ترقی کے نصاب میں انجیل کا اضافہ کر کے رحمت و شفقت اور انسان دوستی کی تربیت دی گئی۔

وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً[5] — اور ان سب کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور انہیں ہم نے انجیل دی اور جنہوں نے ان کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور رحم ڈال دی۔

ان ادوار میں انسان ابھی عہد طفولیت میں تھا، لہٰذا اس کی تربیت و تعلیم کے لیے سمعی و بصری ذرائع سے کام لیا گیا اور انہیں ایسے معجزات دکھائے گئے جو محسوسات و مشاہدات سے متعلق تھے۔

---

[1] ۲/ بقرہ: ۳۱ [2] ۴۲/ شوریٰ ۱۳ [3] ۲۲/ حج: ۷۸ [4] ۶/ انعام: ۱۵۴ [5] ۵۷/ حدید: ۲۷

جب انسان عقل وشعور کے لحاظ سے بلوغت کی منزل کو پہنچ گیا تو اسے محسوس معجزات کی جگہ معقول معجزہ (قرآن) دیا گیا کیونکہ انسان اس قابل ہو گیا تھا کہ اسے ایک جامع ''ضابطۂ حیات'' اور ایک ابدی ''دستور زندگی'' کا امین بنایا جائے۔ چنانچہ قرآن جیسا معجزہ عنایت فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امّت مرحومہ کو اس قابل بنایا کہ وہ اس سرمدی امانت کی حامل بن جائے۔ اس نعمت الٰہی کی معرفت اور اس کی قدردانی کی واحد صورت یہ ہے کہ کلام اللہ کو حتی الامکان سمجھا اور سمجھایا جائے۔

حقیر نے اپنی علمی بے مائیگی اور فکری افلاس کے باوجود اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت اس لیے کی کہ اگرچہ کلام رب الارباب کو اس تراب کے ساتھ کوئی نسبت نہیں، تاہم اس کلام کے مخاطب اور اس پر عمل کرنے کے مکلّف ہم ہی ہیں۔ ثانیاً ہمارے علمائے اعلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے شاگردوں نے صدر اول سے لے کر آج تک اس عظیم امانت کو ہم تک پہنچانے اور اس کی صحیح تفسیر و مفاہیم سے ہمیں آگاہ کرنے میں ہمیشہ دوسروں پر سبقت حاصل کی ہے۔ ان کے علمی سرچشموں سے چند جرعے حاصل کرنے کی جسارت مجھ جیسا بے علم بھی کر سکتا ہے۔ پھر اس چیونٹی نے مقام سلیمانی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرنا ہے۔

چون عود نبود چوب بید آوردم — روئے سیه و موئے سفید آوردم
گفتی توبه کن که نا امیدی کفراست — بر قول تو رفتم و امید آوردم

نیز یہ قدم اس لیے بھی اٹھایا گیا ہے:

۱۔ قرآن حقائق کا ایک بحر بیکراں ہے۔ ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال ہوا: کیا وجہ ہے کہ قرآن کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے نیز اس میں جس قدر غور وفکر کیا جاتا ہے، اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

ان اللّٰه لم یجعله لزمان سدون زمان و لناس دون ناس ۔ فهو فی کل زمان جدید وعند کل قوم غض الی یوم القیامة۔[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ، بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔

۲۔ قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات فراہم کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

۳۔ جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا

---

[1] بحار الانوار ۲: ۲۸۰

موقف بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ غیر ارادی غلطیوں کا امکان بھی موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں مجھے میری خامیوں سے آگاہ فرمائیں۔

اس ترجمے کی طرف مؤمنین کی اطمینان بخش توجہ کی وجہ سے اس کی جو افادیت سامنے آئی ہے، اس کے پیش نظر ہم نے مقدمہ اور حواشی میں قابل توجہ اضافہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ مؤمنین کو قرآنی علوم اور تفسیر سے متعلق ضروری معلومات ایک جلد میں میسر آئیں۔

اس سلسلے میں جن احباب نے میرے ساتھ تعاون فرمایا ہے ان کا شکرگزار ہوں۔ خصوصاً جناب محترم سید اظہر علی رضوی صاحب کی مخلصانہ کاوشیں نہ ہوتیں تو کتاب کی فارمیٹنگ اور طباعت میں یہ خوبصورتی ہرگز نہ آتی۔ خداوند عالم ان کی شب و روز کی زحمتیں قبول فرمائے۔ آمین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

محسن علی بن مولانا اخوند حسین جان رحمۃ اللہ علیہ

اسلام آباد۔ پاکستان

☆☆☆☆☆

# فضائل قرآن

بزبان قرآن۔ بزبان نبی (ص)۔
بزبان وصی (ع) ۔ بزبان زہرا (س)۔
فضائل قرآن در نہج البلاغہ ۔قرآن میں اللہ کی تجلی۔ مستقبل کے علوم۔
جامع ضابطہ حیات۔تعلیم قرآن۔شفاعت ۔زاد آخرت۔ بے مانند نصیحت۔
عہد و پیمان قرآن۔عمل بالقرآن میں اغیار کی سبقت۔ ذریعہ نجات۔
قرآن اور اہل قرآن کے ساتھ سلوک۔فضائل تلاوت قرآن۔
اسماء قرآن۔ معانی قرآن ۔ تدبر قرآن۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## بزبان قرآن

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝[1]

بتحقیق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو امن وسلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور وہ اپنے اذن سے انہیں ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور انہیں راہ راست کی رہنمائی فرماتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝[2]

یہ قرآن یقیناً اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور ان مؤمنین کو جو نیک اعمال بجالاتے ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝[3]

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ قرآن تمہارے پاس نصیحت اور تمہارے دلوں کی بیماری کے لیے شفا اور مؤمنین کے لیے ہدایت ورحمت بن کر آیا ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ[4]

اور اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا کی ہے اسے یاد رکھو اور (یہ بھی) یاد رکھو کہ تمہاری نصیحت کے لیے اس نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۱۵-۱۶ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۹ [3] ۱۰ یونس: ۵۷ [4] ۲ بقرہ: ۲۳۱

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ [1]

یہ (عام) لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت ونصیحت ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ [2]

کہہ دیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ [3]

یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت افروز اور یقین رکھنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ... [4]

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنین کے لیے شفا اور رحمت ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ... [5]

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ ... [6]

اور یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے نازل کی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○ [7]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر نازل کی ہے۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○ [8]

یہ قرآن یقیناً بڑی تکریم والا ہے، جو ایک محفوظ کتاب میں ہے، جسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ [9]

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے۔

**بزبان نبی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان هذا القرآن هو النور المبين

بے شک یہ قرآن نمایاں روشنی ہے

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۳۸ [2] ۱۷ بنی اسرائیل ۸۸ [3] ۴۵ جاثیہ: ۲۰ [4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۲
[5] ۱۴ ابراهیم: ۱ [6] ۶ انعام: ۱۵۵ [7] ۱۶ نحل: ۸۹ [8] ۵۶ واقعہ: ۷۷ تا ۷۹ [9] ۵۹ حشر: ۲۱

| | |
|---|---|
| و الحبل المتين | اور مضبوط رسی ہے |
| والعروة الوثقى | اور محکم وسیلہ ہے |
| والدرجة العليا | بلندترین مرتبہ ہے |
| و الشفاء الاشفى | نہایت مؤثر شفا ہے |
| و الفضيلة الكبرى | اور سب سے بڑی فضیلت ہے |
| والسعادة العظمى | اور سب سے بڑی سعادت ہے۔ |
| من استضاء به نوره اللّٰه | جو اس کے ذریعے روشنی طلب کرے اللہ اسے منور کرتا ہے۔ |
| و من اعتقد به فى اموره عصمه اللّٰه | جس نے اپنے امور کو اس سے مربوط کیا اللہ نے اسے محفوظ رکھا |
| و من تمسك به انقذه اللّٰه | اور جو اس سے متمسک رہا اللہ نے اسے نجات دی |
| و من لم يفارق احكامه رفعه اللّٰه | اور جس نے اس کے احکام کو نہ چھوڑا اللہ نے اسے عزت دی |
| و من استشفى به شفاه اللّٰه | اور جس نے قرآن سے شفا طلب کی خدا نے اسے شفا دی |
| و من آثره على ما سواه هداه اللّٰه | اور جس نے قرآن کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی خدا نے اسے ہدایت بخشی |
| و من طلب الهدى فى غيره اضله اللّٰه | اور جس نے غیر قرآن سے ہدایت چاہی، اللہ نے اسے گمراہ کیا۔ |
| و من جعله شعاره و دثاره اسعده اللّٰه | اور جس نے اسے اپنا شعار اور لازمہ قرار دیا اللہ نے اسے سعادت بخشی |
| و من جعله امامه الذى يقتدى به | اور جس نے اسے اپنا وہ امام بنایا، جس کی وہ پیروی کرتا ہے |
| و معوله الذى ينتهى اليه | اور اپنی وہ پناہ گاہ بنایا جس کی طرف وہ رجوع کرتا ہے |
| اَداه الله الى جنات النعيم و العيش السليم... الخ [1] | تو اللہ تعالیٰ اسے نعمتوں والی جنت اور سکون کی زندگی سے نوازے گا۔ |

[1] تفسیر الامام العسکری (ع) ص۴۵۰ بحار الانوار۸۹: ۳۱۔ کتاب القرآن

فضل القرآن علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقہ۔ [1]

کلام خدا کو دوسرے کلاموں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو خود اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر۔

من قرأ حرفا من کتاب اللّٰہ تعالیٰ فلہ حسنۃ و الحسنۃ بعشر امثالھا، لا اقول الٓمٓ حرف ولکن الف حرف لام حرف و میم حرف۔ [2]

جو کتاب اللہ کے ایک حرف کی تلاوت کرے، اسے ایک نیکی کا ثواب دیا جائے گا اور ایک نیکی کا دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

## بزبان وصی علیہ السلام

مولائے متقیان امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

ثم انزل علیہ الکتاب نوراً لا تطفأ مصابیحہ و سراجا لا یخبو توقدہ و بحرا لا یدرك قعرہ و منھاجا لا یضل نھجہ و شعاعا لا یظلم ضوئہ و فرقانا لا یخمد برھانہ و تبیانالا تھدم ارکانہ و شفاء لا تخشی اسقامہ و عزا لا تھزم انصارہ

اللہ نے رسول کریم (ص) پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی:
جو ایسا نور ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں،
ایسا چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی،
ایسا دریا ہے جس کی تہ تک رسائی نہیں ہوتی،
ایسا راستہ ہے جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی،
ایسی کرن ہے جس کی روشنی مدھم نہیں پڑتی،
وہ حق و باطل میں ایسا امتیاز کرنے والا ہے جس کی دلیل کمزور نہیں پڑتی،
ایسا کھول کر بیان کرنے والا ہے جس کے ستون منہدم نہیں کیے جا سکتے،
وہ سراسر شفا ہے جس کے ہوتے ہوئے (روحانی) بیماریوں کا کھٹکا نہیں،
وہ سراسر عزت و غلبہ ہے جس کے یار و مددگار شکست نہیں کھاتے

---

[1] جامع الاخبار۔ تاج الدین الشعیری ص ۴۰۔ بحار الانوار ۸۹:۱۷
البیان فی تفسیر القرآن، الخوئی ص ۱۸۔ السنن الترمذی ۵:۱۸۴۔ القرآن کی جگہ کلام اللہ ہے۔

[2] السنن الترمذی ۵ : ۱۷۵۔ تفسیر القرطبی ۱ : ۷

| | |
|---|---|
| و حقا لا تخذل اعوانه | وہ سراپاحق ہے جس کے معاون بے یار و مددگار نہیں چھوڑے جاتے۔ |
| فهو معدن الايمان و بحبوحته | وہ ایمان کا معدن اور مرکز ہے۔ |
| و ينا بيع العلم وبحوره | یہ علم کے چشموں اور سمندروں سے عبارت ہے۔ |
| و رياض العدل وغدرانه | اس میں عدل کا چمن اور انصاف کا حوض ہے |
| و اثا فی الاسلام و بنيانه | اور اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے۔ |
| و اودية الحق و غيطانه | حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے۔ |
| وبحر لا ينزفه المستنزفون | وہ ایسا دریا ہے جس سے پانی بھرنے والے اسے ختم نہیں کر سکتے ۔ |
| و عيون لا ينضبها الماتحون | وہ ایسا چشمہ ہے جس سے پانی الچنے والے اسے خشک نہیں کر سکتے۔ |
| و مناهل لا يغيضها الواردون | و ہ ایسا گھاٹ ہے جس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا۔ |
| ومنازل لا يضل نهجها المسافرون | وہ ایسی منزل ہے جس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں۔ |
| و اعلام لا يعمى عنها السائرون | وہ ایسا نشان ہے کہ چلنے والوں کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ |
| و آكام لا يجوز عنها القاصدون | وہ ایسا ٹیلہ ہے کہ جس کا قصد کرنے والے اس سے آگے نہیں گزر سکتے۔ |
| جعله الله ريّا لعطش العلماء | اللہ نے اسے علماء کی تشنگی کے لیے سیرابی، |
| و ربيعا لقلوب الفقهاء | فقیہوں کے دلوں کے لیے بہار، |
| و محاجّ لطرق الصلحاء | اور نیک لوگوں کی رہگذر کے لیے شاہراہ قرار دیا۔ |
| و دواء ليس بعده داء | یہ ایسی دوا ہے جس سے کوئی مرض باقی نہیں رہتا۔ |
| و نوراً ليس معه ظلمة | ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں ہے۔ |
| و حبلا وثيقاً عروته | ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں ۔ |
| و معقلا منيعاً ذروته | ایسی چوٹی ہے کہ جس کی پناہ گاہ مضبوط ہے۔ |
| وعزاً لمن تولّاه | جو اس سے وابستہ ہو اس کے لیے سرمایہ عزت ہے. |

| | |
|---|---|
| وسلما لمن دخله | جو اس کی حدود میں داخل ہو اس کے لیے پیغام صلح و امن ہے۔ |
| و هدی لمن ائتم به | جو اس کی پیروی کرے اس کے لیے ہدایت ہے۔ |
| وعذراً لمن انتحله | جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لیے حجت ہے |
| وبرهانا لمن تكلم به | جو اس کی رو سے بات کرے اس کے لیے دلیل و برہان ہے۔ |
| وشاهدا لمن خاصم به | جو اس کی بنیاد پر بحث و مناظرہ کرے اس کے لیے گواہ ہے۔ |
| وفلجا لمن حاج به | جو اسے حجت بنا کر پیش کرے اس کے لیے فتح و کامرانی ہے۔ |
| و حاملا لمن حمله | جو اس کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے۔ |
| و مطية لمن اعمله | جو اسے اپنا دستور العمل بنائے اس کے لیے وسیلہ راہ ہے۔ |
| وآية لمن توسم | یہ حقیقت شناس کے لیے ایک واضح نشان ہے۔ |
| و جنة لمن استلأم | جو سلاح بند ہو اس کے لیے سپر ہے۔ |
| وعلما لمن وعى | جو فہم رکھتا ہے اس کے لیے علم و دانش ہے۔ |
| و حديثا لمن روى | بیان کرنے والے کے لیے بہترین کلام ہے |
| وحكما لمن قضى۔ [1] | اور فیصلہ کرنے والے کے لیے قطعی حکم ہے۔ |



حارث ہمدانی راوی ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو کچھ لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ (ع) نے فرمایا: واقعاً لوگوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ (ع) نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| اما انی سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله و سلم يقول : ستكون فتن ۔ قلت : و ما المخرج منها؟ قال: كتاب اللّٰه، كتاب اللّٰه | میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا: آئندہ فتنے اٹھنے والے ہیں۔ میں نے عرض کی: راہ نجات کیا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: اللہ کی کتاب۔ اللہ کی کتاب میں |

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۶ ص ۵۵۹۔

فیـه نبأ ما قبلكم و خبر ما بعدكم، و حكم ما بينكم۔ هو الفصل ليس بالهزل هو الذى من تركه من جبار قـصمه اللّٰه، و من ابتغى الهدى فى غيـره أضلــه اللّٰــه فهو حبل اللّٰه المتين، و هو الذكر الحكيم، و هو الـصـراط الـمستقيم،و هو الذى لا تـزيـغ بــه الأهواء، و لا تلتبـس بـه الألسـنة، و لا يشبـع منه العلماء، و لا يخلق عن كثرة الرد، ولا تنقضي عـجـائبه. و هو الذى لم ينته الجن اذ سـمعته ان قالوا : اِنَّاسَمِعۡنَاقُرۡاٰنًا عَجَبًا [3]۔ هـو الـذي مـن قــال بـه صـدق، و من حكم به عدل، و من عـمـل به اجر، و من دعا اليه هدى الـى صراط مستقيم، خذها اليك يا أعور۔ [4]

تم سے پہلوں اور بعد میں آنے والوں کی خبریں اور تمہارے اختلافات کے فیصلے موجود ہیں۔ یہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی ہے۔ فضول اور لایعنی باتیں نہیں ۔ یہ وہ کتاب ہے جسے کوئی جابر مسترد کر دے تو خدا اسے ہلاک و نابود کر دے گا۔[1] جو اسے چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرے ، اللہ اسے گمراہ کر دے گا ۔ یہ کتاب اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ حکمت والی کتاب ہے۔ یہ سیدھا راستہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ مختلف خواہشات اس میں تغیر و تبدیلی نہیں لا سکتیں۔[2] جو زبان قرآن کے ساتھ بات کرے وہ حق و باطل میں اشتباہ نہیں کر سکتی ۔ علماء کا اس سے جی نہیں اکتاتا اور بار بار پڑھنے سے یہ فرسودہ نہیں ہوتی اور اس کے نکتہ ہائے یگانہ بے پایاں ہیں ۔ یہ وہ کتاب ہے جسے سن کر جن یوں بول اٹھے: ہم نے ایک تعجب خیز قرآن سنا۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جو اس کی رو سے بات کرے گا، سچ بولے گا۔ جو اس کے مطابق فیصلہ سنائے گا عدل و انصاف کرے گا۔ جو اس پر عمل کرے گا اسے ثواب ملے گا۔جس نے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی اس نے سیدھے راستے کی طرف بلایا۔ اے اعور! اس (حدیث) کو یاد رکھ۔



---

[1] اس جملے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ جابر لوگ قرآن کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے جو سابقہ کتابہائے آسمانی کے ساتھ ہوا۔ لہٰذا قرآن تحریف سے محفوظ ہے ۔

[2] اس جملے سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن میں تحریف نہ واقع ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے ۔

[3] ۷۲جن : ۱

[4] سنن الدارمی ۲: ۵۲۶۔ سنن الترمذی ۵: ۱۷۲ کچھ فرق کے ساتھ۔ بحار الانوار ۸۹ : ۲۴ لفظی اختلاف کے ساتھ۔ البیان فی تفسیر القرآن (اردو ترجمہ) ص ۱۸۔

## بزبان حضرت فاطمة الزهراء سلام اللہ علیہا

زعیم حق لہ فیکم ، و عهد قدمه الیکم، و بقیة استخلفها علیکم کتاب اللّٰہ الناطق، و القران الصادق، و النور الساطع و الضیاء اللامح، بینة بصائره منکشفة سرائره، منجلیة ظواهره، مغتبطة به اشیاعه ، قائد الی الرضوان اتباعه مؤد الی النجاة استماعه، به تنال حجج اللّٰہ المنورة، و عزائمه المفسرة، و محارمه المحذرة، و بیناته الجالیة، و براهینه الکافیه ، و فضائله المندوبة ، و رخصه الموهوبة و شرائعه المکتوبة ..[1]

یہ قرآن تمہارے درمیان حق کا پاسدار ہے ۔ اللہ کا وہ عہد ہے جو تمہارے لیے پیش کیا گیاہے ۔ وہ جانشین ہے جو تمہارے لیے پیچھے چھوڑا گیا ہے۔ اللہ کی ناطق کتاب اور سچا قرآن ہے ۔ چمکتا نور، روشن چراغ ہے ۔ اس کی بصیرتیں واضح، اس کے اسرار قابل انکشاف، اس کے ظواہر واضح، اس کے پیروکار قابل رشک ہیں۔ اس کی اتباع کرنے والوں کو رضائے حق کی طرف رہنمائی کرنے والا، اس کے سننے والوں کو نجات تک پہنچانے والا، اس سے اللہ کے نورانی دلائل اور اس کے واجب العمل احکام، قابل اجتناب محرمات، واضح دلائل، مکمل براہین، مطلوبہ فضائل، قابل اجازت اعمال اور واجب العمل شریعت تک رسائی ممکن ہے ۔

## فضائل قرآن در نهج البلاغه

نہج البلاغہ میں قرآن مجید کے فضائل اور اس کی قدر ومعرفت کے بارے میں انمول خزانے موجود ہیں۔

## قرآن میں اللہ کی تجلی

..فتجلی لهم سبحانه فی کتابه من غیر ان یکونوا رأوه بما اراهم من قدرته و خوفهم من سطوته[2]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اپنی کتاب (قرآن) میں جلوہ فرمایا تو لوگوں نے اسے دیکھا نہیں مگر قدرت کی ان نشانیوں کے ذریعے، جو اس نے اپنی کتاب میں دکھائیں .....

## مستقبل کے علوم

.... آلا ان فیه علم مایأتی و الحدیث عن الماضی و دواء دائکم و نظم ما بینکم۔[3]

اس (قرآن) میں آئندہ کی معلومات گزشتہ کے واقعات،[3] تمہاری بیماریوں کا چارہ اور تمہارے باہمی تعلقات کی شیرازہ بندی ہے۔

---

[1] الاحتجاج للطبرسی ۱: ۹۹ [2] نہج البلاغة خطبہ ۱۴۵ ص ۳۸۷ ۔
[3] انتہائی قابل توجہ بات ہے کہ مستقبل کے لیے ''علم'' کا لفظ استعمال فرمایا اور ماضی کے لیے ''واقعات'' کا. [4] حوالہ سابق خطبہ ۱۵۶ ص ۴۱۵

## جامع ضابطہ حیات

و اعلموا انه لیس علی احد بعد القرآن من فاقة و لا لاحد قبل القران من غنی۔[1]

جان لو کہ کسی کو قرآن کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج باقی نہیں رہتی اور نہ قرآن کے بغیر کسی کی احتیاج پوری ہوسکتی ہے۔

## تعلیم قرآن

تعلموا القران، فانه احسن الحدیث و تفقهوا فیه فانه ربیع القلوب و استشفعوا بنوره فانه شفاء الصدور و احسنوا تلاوته فانه انفع القصص۔[2]

قرآن کا علم حاصل کرو کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور وفکر کرو یہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو کہ وہ سینوں میں چھپی ہوئی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور اس کی بہتر تلاوت کرو۔ اس کے واقعات سب واقعات سے زیادہ فائدہ مند ہیں۔

## شفاعت

و اعلموا انه شافع مشفع و قائل مصدق و انه من شفع له القران یوم القیامة شفع فیه۔[3]

جان لو کہ قرآن مقبول شفاعت اور تصدیق شدہ کلام کرنے والا ہے ۔ قیامت کے روز جس کی قرآن شفاعت کرے گا وہ اس کے حق میں مانی جائے گی ۔

## زاد آخرت

فانه مناد ینادی یوم القیامة الا ان کل حارث مبتلی فی حرثه و عاقبة عمله، غیر حرثة القران، فکونوا من حرثته و اتباعه۔[4]

قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا: دیکھو ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں مبتلا ہے سوائے قرآن کی کھیتی بونے والوں کے۔ لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اس کے پیروکار بنو۔

## بے مانند نصیحت

و ان اللّٰه سبحانه لم یعظ احداً بمثل هذا القران فانه حبل اللّٰه المتین و سببه الامین و فیه ربیع القلب و ینابیع العلم و ما للقلب جلاء غیره ۔[5]

اللہ سبحانہ نے کسی کو ایسی نصیحت نہیں فرمائی جو اس قرآن کی مانند ہو ۔ کیونکہ یہ اللہ کی مضبوط رسی اور مطمئن وسیلہ ہے اور اس میں دلوں کی بہار اور علوم کے چشمے ہیں اور صرف اس سے قلب کی جلا ہوتی ہے ۔

---

[1] حوالہ سابق خطبہ ۱۷۴ ص ۴۶۱ [2] حوالہ سابق خطبہ ۱۰۸ ص ۳۸۹۔
[3] حوالہ سابق خطبہ ۱۷۴ ص ۴۶۱ [4] حوالہ سابق ص ۴۶۲ [5] حوالہ سابق ص ۴۶۴

## عہد و پیمان قرآن

و لن تأخذوا بميثاق الكتاب حتى تعرفوا الذى نقضه... فالتمسوا ذلك من عند اهله۔[1]

تم قرآن کے عہد و پیمان کے ہرگز پابندہ نہ رہ سکو گے جب تک اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو۔ جو ہدایت والے ہیں انہی سے ہدایت طلب کرو.

## عمل بالقرآن میں اغیار کی سبقت

اللّٰه اللّٰه فى القران لا يسبقكم بالعمل به غيركم۔[2]

قرآن کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کہیں دوسرے لوگ اس پر عمل کرنے میں تم پر سبقت نہ لے جائیں.

## ذریعۂ نجات

و عليكم بكتاب اللّٰه فانه الحبل المتين و النور المبين و الشفاء النافع و الرّىّ الناقع و العصمة للمتمسّك و النجاة للمتعلق ۔[3]

تم کتاب خدا پر عمل کرو۔ وہ ایک مضبوط رسی، روشن نور، نفع بخش شفا، پیاس بجھانے والی سیرابی ہے ۔ تمسک کرنے والے کے لیے سامان حفاظت اور وابستہ رہنے والے کے لیے نجات ہے ۔

## قرآن اور اہل قرآن کے ساتھ سلوک

ياتى على الناس زمان لا يبقى فيهم من القران الا رسمه[4]

و ليس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الكتاب اذا تلى حق تلاوته و لا انفق منه اذا حرّف عن مواضعه ... فالكتاب يومئذ و اهله منفيان طريدان و صاحبان مصطحبان فى طريق واحد لا يؤويهمامؤو۔

فالكتاب و اهله فى ذلك الزمان فى الناس و ليسا فيهم و معهم و

لوگوں پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جب ان میں قرآن کے صرف نقوش باقی رہ جائیں گے۔
اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہو گی جب اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ قیمتی چیز نہیں ہو گی جب کہ اس کی آیتوں کی تحریف کی جائے۔ قرآن اور قرآن والے اس وقت راندہ ہوں گے۔ ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے، انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہو گا۔
وہ بظاہر لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق۔ اس



---

[1] حوالہ سابق خطبہ ۱۴۵ ص ۳۹۸ [2] حوالہ سابق، وصیت ۴۷ ص ۴۳۸
[3] حوالہ سابق خطبہ ۱۵۴ ص ۴۰۹ ۔ حال اهل القبور فى القيامة۔ [4] حوالہ سابق ۔کلمات قصار ۳۶۹ ص ۹۲۴

لیسا معهم، لان الضلالة لا توافق الهدیٰ و ان اجتمعا فاجتمع القوم علی الفرقة و افترقوا الجماعة کانهم ائمة الکتاب و لیس الکتاب امامهم (۱)

لیے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہوسکتی اگرچہ وہ یک جا ہوں۔ لوگوں نے تفرقہ پردازی پر اتفاق کیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا وہ قرآن کے پیشوا ہیں اور قرآن ان کا پیشوا نہیں۔

## فضائل تلاوت قرآن

کس قدر سعادت کا مقام ہے کہ انسان قرآن کے کلمات اپنی زبان پر جاری کرے اور اس میں غور وفکر کرے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان قدرت پر جاری فرمایا۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ [۲]
وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا [۳]

لہٰذا تم آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔
اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے۔

نیز فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۙ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ... [۴]

بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور رہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے ساتھ امید لگائے ہوئے ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا تاکہ اللہ ان کا پورا اجر انہیں دے بلکہ اپنے فضل سے مزید بھی عطا فرمائے۔

رسول کریم (ص) سے روایت ہے:

من قرأ حرفا من کتاب اللّٰه تعالیٰ فله به حسنة و الحسنة بعشر امثالها، لا اقول الم حرف و لکن الف حرف و لام حرف و میم حرف۔ [۵]

جو کتاب اللہ کے ایک حرف کی تلاوت کرے، اسے ایک نیکی کا ثواب دیا جائے گا اور ایک نیکی کا دس گنا ثواب ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

نیز آپؐ سے روایت ہے:

یااباذر علیك بتلاوة القرآن و ذکر

اے ابوذر! تم قرآن کی تلاوت اور ذکر خدا کثرت

---

۱۔ حوالہ سابق خطبہ ۱۴۵ ص ۳۳۸ ۲۔ ۷۳ مزمل: ۲۰ ۳۔ حوالہ سابق: ۴ ۴۔ ۳۵ فاطر: ۲۹۔۳۰
۵۔ سنن الترمذی ۵: ۱۷۵۔ تفسیر قرطبی ۱: ۷

اللّٰہ کثیراً فانه ذکر لك فی السماء و نور لك فی الارض۔[1]

سے کیا کرو کیونکہ یہ تمہارے لیے آسمان میں شہرت اور زمین میں نورانیت کا باعث ہے۔

حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

من قرأ عشر آیات فی لیلة لم یکتب من الغافلین ، و من قرأ خمسین آیة کتب من الذاکرین، و من قرأ مأة آیة کتب من القانتین، و من قرأ مأتی آیة کتب من الخاشعین، و من قرأ ثلثمأة آیة کتب من الفائزین، و من قرأ خمسمأة آیة کتب من المجتهدین، و من قرأ الف آیة کتب له قنطار من تبر۔[2]

جو ایک رات میں دس آیات کی تلاوت کرے اسے غافلین میں شمار نہیں کیا جائے گا اور جو پچاس آیات کی تلاوت کرے اسے ذکر خدا میں مشغول رہنے والوں میں شمار کیا جائے گا اور جو ایک سو آیات کی تلاوت کرے اسے عبادت گزاروں میں شمار کیا جائے گا، جو تین سو آیات کی تلاوت کرے اسے کامیاب لوگوں میں شمار کیا جائے گا اور جو پانچ سو آیات کی تلاوت کرے اسے (راہ خدا میں) جہاد کرنے والوں میں شمار کیا جائے گا اور جو ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے گا وہ ایسا ہے جیسے اس نے کثیر مقدار میں سونا راہ خدا میں دیا ہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (ع) نے اپنے جد سے روایت کی ہے:

علیکم بتلاو ة القرآن فان درجات الجنة علی عدد آیات القرآن فاذا کان یوم القیامة یقال لقاری القرآن: اقرأ و ارق فکلما قرأ آیة رقی درجة۔[3]

تم قرآن کی تلاوت ضرور کیا کرو، چونکہ جنت کے درجات قرآنی آیات کی تعداد کے برابر ہیں، جب قیامت کا دن ہوگا قرآن کی تلاوت کرنے والے سے کہا جائے گا: پڑھ اور اپنے درجات میں اضافہ کرتا جا۔ پس جب وہ ایک آیت پڑھتا ہے تو ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل بہترین ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

الحال المرتحل قلت و ما الحال المرتحل؟ قال فتح القران و ختمه.

بہترین عمل حال مرتحل ہے۔ میں نے عرض کی: حال مرتحل کیا چیز ہے؟ فرمایا: قرآن کا کھولنا اور ختم کرنا.

---

[1] بحار الانوار ۸۹: ۱۹۸ [2] اصول الکافی ۲: ۶۱۲ [3] الامالی للصدوق ص ۳۵۹

كلما جاء باوله ارتحل فی آخره۔[1]

جب بھی قرآن کی ابتدا پر آیا، آخر کی طرف روانہ ہوا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

و البيت الذی يقرأ فيه القران و يذكر الله عز و جل فيه تكثر بركته و تحضره الملائكة و تهجره الشياطين و يضئ لاهل السماء كما يضئ الكوكب الدری لاهل الارض و البيت الذی لا يقرأ فيه القران و لا يذكر الله فيه تقلّ بركته و تهجره الملائكة و تحضره الشياطين ۔[2]

جس گھر میں قرآن کی تلاوت اور ذکر خدا ہوتا ہے اس میں وافر برکتیں ہوتی ہیں، فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔ آسمان والوں کے لیے یہ گھر اس طرح چمکتا ہے جیسے زمین والوں کے لیے درخشندہ ستارے اور جس گھر میں قرآن کی تلاوت نہیں ہوتی اور اللہ کا ذکر نہیں ہوتا، اس گھر کی برکت کم ہو جاتی ہے اور وہاں سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں اور شیطانوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے روایت ہے:

من قراء اٰية من كتاب الله فی صلاته قائماً يكتب له بكل حرف مأة حسنة ، فان قرأها فی غير صلاة كتب الله بكل حرف عشراً، فان استمع القران كان له بكل حرف حسنة ...۔[3]

جو حالت نماز میں کھڑے ہو کر ایک آیت کی تلاوت کرے، اسے ہر حرف کے عوض سو نیکیوں کا ثواب ملے گا اور غیر نماز کی حالت میں پڑھے تو ہر حرف کے لیے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا اور اگر سنے تو ہر حرف کے عوض ایک نیکی کا ثواب ملے گا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت ہے:

و احسنوا تلاوته فانه انفع القصص ۔[4]

اور اس کی تلاوت بہترین طریقے سے کرو کیونکہ یہ مفید واقعات ہیں۔

## اسمآء القرآن

اصطلاحات اور اسماء کا کسی خاص ثقافت اور فکری تشخص میں بڑا دخل ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید باوجودیکہ عربی زبان میں ہے اور ایک عرب معاشرے میں نازل ہو رہا ہے، اس کے اسماء اور اصطلاحات منفرد ہیں اور دیگر عربی اصطلاحات سے متاثر نہیں ہیں، بلکہ قرآن نے اپنی فکری، علمی اقدار کی خاص نہج کو

---

[1] اصول الکافی ۲: ۶۰۵ [2] حوالہ سابق ۲: ۴۹۸
[3] بحار الانوار ۸۹: ۲۰۱ طبع بیروت [4] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۰۸ ص ۳۱۶

سامنے رکھ کر اپنی غرض و غایت کے مطابق اسماء اور اصطلاحات مقرر کی ہیں ۔ لہٰذا اگر قرآن کو دیوان، سورہ کو قصیدہ اور آیت کو بیت اور قصیدہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تو قرآن اس وقت کے جاہلی ماحول سے خارج نہ ہوتا۔ لہٰذا جاہلیت سے دور اسلامی ثقافت کی ترویج کے لیے جدید اسماء اور جدید اصطلاحات وضع کی گئیں ۔

**قرآن :** کتاب خدا کے لیے یہ نام خود خداوند عالم نے اپنی کتاب میں اس وقت دیا جب قرآن قلب رسول (ص) پر اترنا شروع ہوا ۔

| | |
|---|---|
| يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۙ[1] | اے کپڑا لپیٹنے والے، رات کو اٹھا کیجئے مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے یا اس پر کچھ بڑھا دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجیے۔ |

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ[2] | یہ قرآن یقیناً بڑی تکریم والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں ہے۔ |

**ذکر:** قرآنی اسماء میں سے ایک اسم ذکر ہے ۔ ارشاد ہے :

| | |
|---|---|
| اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝[3] | اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ |
| وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ ...[4] | اور (اے رسول ) آپ پر (بھی) ہم نے ذکر اس لیے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتا دیں ۔ |
| وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۙ[5] | اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے ۔ |

**کتاب:** قرآن کے اسماء میں سے ایک مشہور نام کتاب ہے:

| | |
|---|---|
| ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ[6] | یہ کتاب جس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ۔ |
| اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ....[7] | (اے رسول ) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ کی طرف نازل کی ہے تا کہ جیسے اللہ نے آپ کو بتایا ہے اسی کے مطابق لوگوں میں فیصلے کریں۔ |

---

[1] ۷۳ مزمل: ۱ تا ۴ [2] ۵۶ واقعہ: ۷۷ ۔ ۷۸ [3] ۱۵ حجر: ۹
[4] ۱۶ النحل: ۴۴ [5] ۲۱ انبیاء: ۵۰ [6] ۲ بقرۃ: ۲ [7] ۴ نساء: ۱۰۵

قرآن کو کتاب کے نام سے موسوم کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن ایک ایسا دستور الٰہی ہے جو تحریر و کتابت کے ذریعے مدون رہے گا۔

ان کے علاوہ اور بھی اسماء کا ذکر کیا گیا ہے مگر یہ قرآن کے اوصاف ہیں، اسماء نہیں ہیں۔

**فرقان:** یہ لفظ فَرَقَ سے ماخوذ ہے۔ جیسے خَسَرَ سے خُسْران اور غَفَرَ سے غُفْران ہے۔ یہ مصدر ہے جو فاعل کے معنوں میں آتا ہے جیسے عَدْل بمعنی عادل آتا ہے۔ پس فُرْقان کے معنی نمایاں فرق کرنے والا یعنی حق و باطل کو جدا جدا کر کے ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے والا کے ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا [1]

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہیں (حق و باطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا فرمائے گا۔

قرآن کو فُرْقان کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ خود قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا [2]

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ سارے جہان والوں کے لیے انتباہ کرنے والا ہو۔

گویا عالمین کو حق و باطل کی پہچان کرا کر اسے تنبیہ کرنے کے لیے قرآن کو فرقان قرار دیا۔ یعنی یہ کتاب حق و باطل، ہدایت و ضلالت، راہ جنت و جہنم، حلال و حرام میں فرق واضح کرتی ہے۔

## معانی قرآن

**۱۔ جمع:** اگر قرآن کو قَرَءَ سے ماخوذ سمجھا جائے تو اس کے معنی جمع کے ہوں گے جیسے عربی میں یہ جملہ بکثرت استعمال ہوتا ہے: قراء ت الشیء یعنی جمعته اور قرء الماء فی الحوض یعنی پانی حوض میں جمع ہو گیا۔

ممکن ہے اسے قرآن اس کے معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہو کہ یہ شعری رقت، نثری روانی، عقائد احکام، اخلاق، دنیا و آخرت کی سعادتوں اور روحانی و مادی فیوضات کا مجموعہ ہے۔

**۲۔ تلاوت:** بعض لوگ قرآن کو قَرَءَ سے مشتق سمجھتے ہوئے اس کے معنی ''تلاوت'' لیتے ہیں۔

---

[1] ۸ انفال: ۲۹ [2] ۲۵ فرقان: ۱ [3] ۷۵ قیامت: ۱۸

قرآن بمعنی قراءت وتلاوت خود قرآن میں استعمال ہوا ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ [1] — اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

لفظ قرآن کو لفظ جمع کے ساتھ بیان کرنے کی صورت میں دونوں کا ایک ہی معنی نہیں ہوسکتا بلکہ جمعہ کے بعد قرآنہ کا معنی تلاوت ہی ہوسکتا ہے۔

**۳۔ حفظ:** عربوں میں کتابت رائج نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ضروری مطالب حفظ کر لیتے تھے۔ اسی وجہ سے صدر اسلام میں لفظ قرأۃ حفظ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

**۴۔ مقرون:** کچھ علماء قرآن کو قرن سے مشتق جانتے ہوئے اس کا معنی مقرون کا لیتے ہیں۔ یعنی اس کی آیات اور سورتیں باہم ساتھ ساتھ اور پیوستہ ہیں، اس لیے اسے قرآن کہا گیا۔ جیسا کہ حج اور عمرہ کو باہم ساتھ ادا کرنے کی وجہ سے اسے حج قِران کہتے ہیں۔

بعض مستشرقین کا کہنا ہے کہ لفظ قرء جو پڑھنے کے معنی میں ہے، اس کی بنیاد سریانی یا عبرانی ہے۔ چونکہ ان زبانوں میں قریانا (Qiryana) پڑھنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ وہ چرچ میں اپنی مقدس کتابوں کی تدریس کو قریانا کہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ لفظ خالصتاً عربی ہے اور قرآن قَرَءَ سے ماخوذ ومشتق ہے۔ یوں لفظ قرآن ''پڑھنے'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرینہ کے لحاظ سے دوسرے معنوں میں کم ہی استعمال میں آتا ہے۔ لہٰذا:

☆ لفظ قرآن قَرَأَ، یَقْرَأُ باب فَتَحَ، یَفْتَحُ کا مصدر ہے۔

☆ اس کے تین مصادر آتے ہیں: قَرْءٌ، قَرَاءَۃٌ، قُرْاٰنٌ۔ اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوئے: ''پڑھی جانے والی کتاب''۔ چنانچہ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کتاب خوب پڑھی جائے گی۔ چنانچہ قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔



## تدبر قرآن

ارشاد رب العزت ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ [2] — یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبان عقل اس سے نصیحت حاصل کریں۔

---

[1] ۷۵ قیامت: ۱۷ [2] ۳۸ ص: ۲۹

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا○[1]

کیا لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا○[2]

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

لقد تجلی اللّٰہ لخلقه فی کلامه و لکنهم لا یبصرون[3]

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں تجلی فرمائی ہے لیکن لوگ دیکھ نہیں سکتے۔

---

[1] محمد: ۲۴ [2] نساء ۸۲ [3] بحار الانوار ۸۹: ۱۰۷

# وَحْی

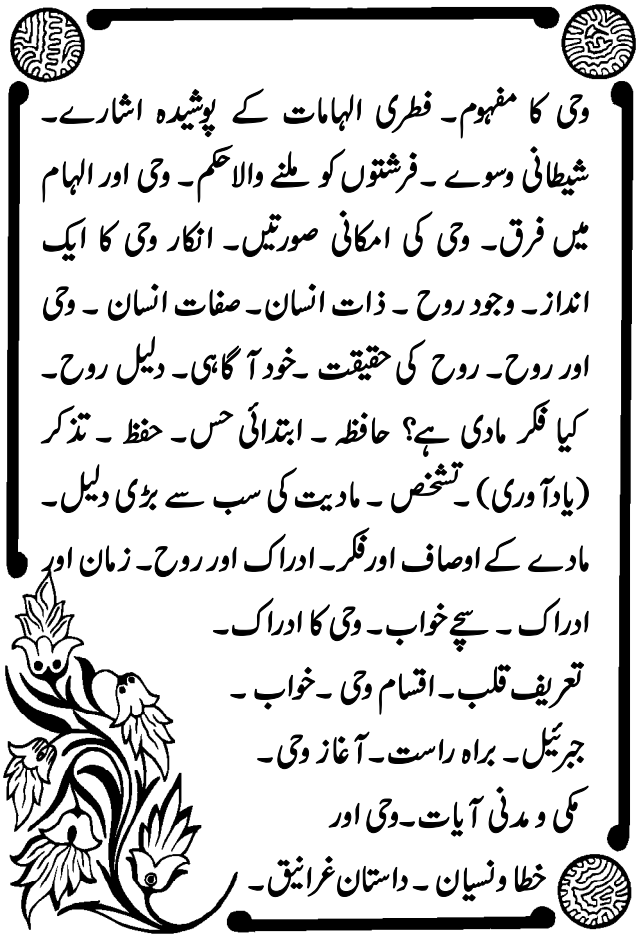

وحی کا مفہوم۔ فطری الہامات کے پوشیدہ اشارے۔
شیطانی وسوے ۔فرشتوں کو ملنے والا حکم۔ وحی اور الہام
میں فرق۔ وحی کی امکانی صورتیں۔ انکار وحی کا ایک
انداز۔ وجود روح ۔ ذات انسان۔ صفات انسان ۔ وحی
اور روح۔ روح کی حقیقت ۔خود آ گاہی۔ دلیل روح۔
کیا فکر مادی ہے؟ حافظہ ۔ ابتدائی حس۔ حفظ ۔ تذکر
(یادآوری) ۔تشخص ۔ مادیت کی سب سے بڑی دلیل۔
مادے کے اوصاف اور فکر۔ ادراک اور روح۔ زمان اور
ادراک ۔ سچے خواب۔ وحی کا ادراک۔
تعریف قلب۔ اقسام وحی ۔خواب ۔
جبرئیل۔ براہ راست۔ آغاز وحی۔
مکی و مدنی آیات۔وحی اور
خطا ونسیان ۔ داستان غرانیق۔

## وَحْی کا مفہوم

لغت میں وحی نہایت تیزی سے دیے جانے والے اشارے کو کہتے ہیں۔

راغب اصفہانی نے لکھا ہے: اصل الوحی الاشارۃ السریعہ۔

شرعی اصطلاح میں بھی لغوی معنی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ تعلیمات اسلامی میں وحی نہایت پوشیدہ اور تیز رو اطلاع کو کہتے ہیں ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ حس و مشاہدے میں نہیں آ سکتا کہ وہ اپنے رسولوں سے روبرو بات کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے ہمکلام ہونے کے تین طریقے اپنائے ۔

ارشاد الٰہی ہے:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ [1]

اور کسی بشر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے ماسوائے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ کوئی پیام رساں بھیجے ، پس وہ اس کے حکم سے جو چاہے وحی کرے، بے شک وہ بلند مرتبہ، حکمت والا ہے۔

اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ کے کسی انسان سے ہمکلام ہونے، يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ کلام بذریعہ وحی ۲۔ کلام پس پردہ ۳۔ کلام بذریعہ قاصد

پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے قلب پر اپنا کلام براہ راست نازل فرماتا ہے۔

دوسری صورت میں پردے کے توسط سے، مگر یہاں پردے کو وحی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پس پردہ کلام کرنا بھی وحی ہے، مگر یہ وحی بالحجاب ہے۔ مثلاً درخت کے ذریعے کلام کرنا یا خواب میں حکمِ الٰہی کا ملنا وحی بالحجاب میں شامل ہے۔ بعض نے درخت کے ذریعے کلام کرنے کو براہ راست وحی خیال کیا ہے جو ایک اشتباہ ہے۔ کیونکہ درخت اور خواب اللہ اور بندے کے درمیان حجاب ہیں۔

تیسری صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے قاصد (فرشتے) کے ذریعے اپنے بندے سے ہمکلام ہوتا ہے۔ یہ بھی وحی ہے مگر اس میں قاصد کی قید ہے اور اس مرتبہ قاصد کو وحی میں دخل ہے۔ فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ یعنی

---

[1] ۴۲ شوریٰ: ۵۱

یہ قاصد بحکم الٰہی وحی پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

رسول کریم (ص) پر کبھی جبرئیل وحی لے کر نازل ہوتے تھے اور کبھی اللہ تعالیٰ آپ (ص) سے براہ راست ہمکلام ہوتا تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ جبرئیل کے نزول کے وقت کیا رسول اللہ (ص) پر غشی طاری ہوتی تھی؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: نہیں، بلکہ حضور (ص) پر اس وقت غشی طاری ہوتی تھی جب اللہ تعالیٰ آپؐ سے براہ راست ہمکلام ہوتا تھا۔[1]

بعض قرآنی آیات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ حضور (ص) وحی کو اپنے پورے وجود کے ساتھ سمجھ لیتے تھے، نہ کہ صرف کانوں اور آواز کے ساتھ۔ چنانچہ ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾[2]

جسے روح الامین نے اتارا آپ کے قلب پر تاکہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

اس سے واضح ہوا وحی، قلب رسول (ص) پر نازل ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ﴿۱۰﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾[3]

پھر اللہ نے اپنے بندے پر جو وحی بھیجنا تھی وہ وحی بھیجی جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا تو کیا جسے انہوں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھا ہے تم لوگ (اس کے بارے میں) ان سے جھگڑتے ہو؟

لفظ وحی قرآن مجید میں اس کے علاوہ بھی متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے:

**۱۔ فطری الہامات کے پوشیدہ اشارے:** ارشاد الٰہی ہے:

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ...[4]

اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی کی کہ انہیں دودھ پلائیں۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾[5]

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں گھر (چھتے) بنائے۔

**۲۔ شیطانی وسوسے:**

وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ[6]

اور شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں یقیناً شکوک پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔

---

[1] موجز علوم القرآن ص ۱۱۱ داؤد عطار
[2] ۲۶ شعراء: ۱۹۳۔۱۹۴
[3] ۵۳ نجم: ۱۰ تا ۱۲
[4] ۲۸ قصص: ۷
[5] ۱۶ نحل: ۶۸
[6] ۶ انعام: ۱۲۱

### ۳۔فرشتوں کو ملنے والا حکم:

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ ... [1] جب آپ کا رب فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں۔

**الہام اور وحی میں فرق:** الہام کسی کے دل میں کوئی بات ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے دل میں ڈالی جانے والی بات کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ الہام کا تعلق باطنی شعور سے ہے۔ الہام ایک اشراقی عمل ہے۔ الہام ماہرنفسیات کے دائرہ تجربہ میں آ سکتا ہے جب کہ وحی تجربے میں نہیں آتی اور قابل تجربہ نہیں ہے۔ الہام تحت الشعور میں ہوتا ہے جب کہ وحی شعور میں ہوتی ہے۔ الہام کا مصدر باطنی ہے، جب کہ وحی کا مصدر خارجی ہے۔ الہام کشف معنوی ہے، جب کہ وحی مشاہداتی حقیقت ہے۔ وحی میں کلام وصوت کے ذریعہ مطالب اخذ کیے جاتے ہیں، جب کہ الہام اشراقی لہروں کے ذریعے ذہن کے تصورات میں آنے والے بغیر حروف واصوات کے مطالب ہیں۔

**وحی کی امکانی صورتیں:** جو لوگ مادیت کی ظلمتوں اور محسوسات کے تنگ دائروں میں رہ کر سوچنے کے عادی ہیں اور ماورائے مادہ کے ذوق سے محروم ہیں، وہ حقیقت وحی کے ادراک سے قاصر ہیں۔ چونکہ وحی عام انسانوں کے لیے نامحسوس ہے، اس لیے یہ لوگ وحی کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ ہر روز ہمارے اردگرد سینکڑوں ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جو محسوسات پر مبنی نہیں ہوتے لیکن انہیں تسلیم کیا جاتا ہے۔

مثلاً بعض جاندار ایسے ہیں جن کے نامرئی اور غیر محسوس ادراکات ہمارے لیے ناقابل فہم ہیں۔ اس سلسلے کی سینکڑوں مثالوں میں سے ہم صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: مچھلی کی ایک قسم ایسی ہے کہ جب یہ پانچ سال کی عمر کو پہنچتی ہے تو مصر کے دریائے نیل سے نکل پڑتی ہے اور بحیرہ روم سے ہوتی ہوئی بحرِ اوقیانوس کو عبور کرتی ہے اور دو ہزار میل سے زائد سفر طے کر کے ''برمودا'' کے قریب گہرے سمندروں میں پہنچ جاتی ہے، جہاں امریکہ کے دریاؤں سے آنے والی مچھلیوں میں مل جاتی ہے۔ پھر سمندر کی گہرائی میں اس مقام پر انڈے دیتی ہے جہاں پانی میں نمک کی مقدار ۳۵ % اور گہرائی بارہ سو فٹ ہوتی ہے۔ یہ دو امور انڈوں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ انڈے دینے کے بعد یہ سب مچھلیاں مر جاتی ہیں۔

جب بچے انڈوں سے نکل آتے ہیں تو نہایت قابل تعجب بات یہ ہے کہ وہ بچے جن کی مائیں افریقہ یا یورپ سے آئی ہوں، وہ وہاں جاتے ہیں اور جن کی مائیں امریکہ سے آئی ہوں، وہ امریکہ کے دریاؤں کا رخ کرتے ہیں اور دو ہزار میل سے زائد کا یہ سفر دو سال میں طے کرتے ہیں۔

ان بچوں کو اپنی بن دیکھی ماؤں کے اس وطن کا جو دو ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر موجود ہے، کیسے

---

[1] ۸ انفال: ۱۲

پتہ چلا اور کس نے انہیں یہ راہیں دکھائیں ۔ کیا مچھلی کے ان بچوں کا یہ ادراک ہمارے لیے قابل فہم ہے؟[1] اس کے علاوہ بعض جانور ایسے ہیں جو ہائیڈروجن ایٹم کے آدھے حصے میں ہونے والی حرکت سن اور محسوس کر سکتے ہیں ۔

خود انسان میں بھی ایسی لا متناہی قوت پوشیدہ ہے جس کا انسان کو اجمالی علم ہوا ہے ۔ چنانچہ عالمی شہرت یافتہ ماہر نفسیات ''الیکسس کارل'' اپنی کتاب Man the unknown میں لکھتا ہے:

زمان و مکان میں افراد کی حد بندی صرف ایک مفروضہ ہے۔[2]

یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان میں ایک ایسی طاقت پنہاں ہے جس کے ذریعے سے عام انسان بھی دوسروں سے غیر مرئی اور غیر مادی ارتباط قائم کر سکتا ہے یعنی مادی وسائل اور حواس خمسہ کے بغیر دماغ میں براہ راست ایک مفہوم و مطلب ڈال دیا جاتا ہے۔ اسے دماغی لہروں کا نظریہ (Brain wave Theory) کہتے ہیں۔

مادہ پرستوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مادے کے دائرے میں رہ کر بات کیا کریں اور صرف مادی چیزوں کے بارے میں ہی اپنا نظریہ بیان کیا کریں۔ انہیں غیر مادی امور میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب وہ محسوسات کے علاوہ کسی چیز کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو غیر محسوسات کے بارے میں کوئی نظریہ نفیاً یا اثباتاً قائم ہی نہیں کر سکتے ۔ یعنی اگر یہ لوگ وحی کو قبول نہیں کرتے تو اس کی نفی بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ اگر یہ اس کی نفی کریں گے تو یہ غیر مادی امور میں دخل اندازی ہے جس کے یہ لوگ خود قائل نہیں ہیں۔

**انکار وحی کا ایک اور انداز:** وحی کا انکار کرنے والے کچھ لوگ اس کی یوں توجیہ کرتے ہیں:

> چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نابغۂ روزگار تھے جو اپنے دور کے تاریک معاشرے، اس کے انحطاط اور اس میں رائج ظلم و استحصال سے سخت نالاں تھے۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتے رہتے تھے کہ اس قوم کو کیسے نجات دلائی جائے جو ذلت و رسوائی کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی ہے ۔ چنانچہ چالیس سال تک وہ اس ظلم اور تاریک معاشرے سے گریزاں اور دور رہے اور الگ تھلگ ایک غار میں بیٹھ کر سوچتے رہے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ محمد(ص) اپنے ان پاکیزہ افکار کو وحی تصور کرتے تھے اور منجانب اللہ سمجھتے تھے اور اپنے خیر خواہ نفس کو جبرئیل کا نام دیتے تھے۔

---

[1] کس قدر فکر انگیز ہے حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان: یعلم عجیج الوحوش فی الفلوات ... و اختلاف النینان فی البحار الغامرات وہ (اللہ) بیابانوں میں چوپاؤں کے نالے سنتا ہے اور دریاؤں کی اتھاہ گہرائی میں مچھلیوں کی آمد و رفت کو جانتا ہے۔ نہج البلاغۃ خ ۱۹۶ ص ۵۵۵۔

[2] بحوالہ عربی ترجمہ الانسان ذلك المجهول۔

ان میں جو وجود خدا کے بھی منکر ہیں وہ وحی، ثواب، عذاب، جنت اور جہنم کے تصور کو ''مذہبی سیاست'' کا نام دیتے ہیں اور ان تمام تعلیمات کو ''دروغِ مصلحت آمیز'' گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پرانے زمانے کے لوگ خرافات پسند تھے، اس لیے انبیاء (ع) نے خرافات کو ہی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

**جواب**: خود قرآن مجید اس تصور کو رد کرتا ہے کہ قرآن غیر خدا کا کلام ہوسکتا ہے:

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ [1]

اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس قرآن کو اللہ کے سوا کوئی اور اپنی طرف سے بنا لائے بلکہ یہ تو اس سے پہلے جو (کتاب) آ چکی ہے اس کی تصدیق ہے اور تمام (آسمانی) کتابوں کی تفصیل ہے اس میں کوئی شبہ نہیں، رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمد نے) از خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو بلا لاؤ۔

**ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:**

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ [2]

کہہ دیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل لا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

**یہ بھی ارشاد ہوا:**

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ [3]

اور اگر تم لوگوں کو اس (کتاب) کے بارے میں شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسا کوئی سورہ بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ اپنے حامیوں کو بھی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔

**نیز ارشاد الٰہی ہوا:**

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○ [4]

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۳۷۔ ۳۸ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۸ [3] ۲ بقرہ: ۲۳ [4] ۴ نساء: ۸۲

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس خطبات اور کلام رسول محفوظ ہے اور قرآن بھی ہمارے سامنے ہے۔ دونوں کا اسلوب سخن اور انداز کلام ہمارے سامنے ہے۔ ادب میں ایک ادنیٰ سا مقام رکھنے والا بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے ہیں یا نہیں۔ جب کہ قران مجید اور کلام رسول(ص) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کا اسلوب سخن جدا ہے۔ اگر معاذاللہ قرآن کلام الٰہی نہ ہوتا اور خود جناب ختمی مرتبت محمد (ص) نے ( معاذ اللہ ) بنایا ہوتا تو لازماً حضور (ص) کے اسلوب سخن کا عکس قرآن میں بھی نظر آتا۔

**وجود روح** :وحی چونکہ ایک خالصتاً روحانی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق براہ راست روح سے ہے اس لیے افادہ عام کے لیے ہم یہاں وجود روح کے بارے میں قدیم و جدید فلسفیوں کے نظریات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ۔

**ا۔ ذات انسان**: اس انسان کا ایک باطنی وجود ہے جسے نفس کہتے ہیں اور یہی نفس انسان کی ذات کی تشکیل کرتا ہے اور یہی اس انسان کا حقیقی، اصلی، ثابت و لایتغیر وجود ہے۔ چنانچہ انسان کے ظاہری وجود، جسم پر ہزاروں تغیرات آتے رہتے ہیں لیکن اس کے ثابت وجود پر کوئی تغیر نہیں آتا اور اس چیز کو ہر انسان درک کر لیتا ہے کہ اس کی ذات اس جسم کے ماوراء کسی اور شئی کا نام ہے ۔

الف۔ ہم اپنے اس حقیقی وجود کی طرف جب اشارہ کرتے ہیں تو لفظ ''خود'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں جب کہ لفظ'' خود'' سے ذات مراد لی جاتی ہے ، نہ کہ اعضاء و جوارح ۔ یعنی اپنے خارجی اعضاء ، سر، شکم، پیر وغیرہ مراد نہیں لیتے اور اعضاء داخلی قلب، جگر وغیرہ بھی مراد نہیں لیتے بلکہ لفظ'' خود'' سے صرف ذات مراد لیتے ہیں جو داخلی و خارجی اعضاء سے ماوراء شے ہے ۔

ب۔ انسان سے صادر ہونے والے تمام افعال ذات انسان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور کہتے ہیں: میں نے کہا، میں نے مارا، میں نے کھایا، میں نے بات کی ۔ ان افعال کو اپنے اعضاء و جوارح کی طرف نسبت نہیں دی جاتی اور یہ نہیں کہتے: میرے ہاتھ نے مارا، میری زبان نے کہا وغیرہ۔

ج ۔ ہم نے اگر کسی سے خطاب کرنا ہو یا کسی کی مدح و مذمت کرنی ہو تو ذات انسان کو سامنے رکھتے ہیں ، اس کے جسم کو نہیں ۔ مثلاً کسی کو مارنے کا حکم دینا ہے تو ہاتھ کو مخاطب نہیں کرتے ، کسی کو متنبہ کرنا ہے تو متعلقہ اعضاء کو مخاطب نہیں کرتے بلکہ ذات انسان کو مخاطب کرتے ہیں۔

د ۔ انسان اپنے اعضاء سے غافل ہوسکتا ہے لیکن اپنی ذات سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جن چیزوں سے غافل ہوسکتا ہے وہ بنیادی چیز نہیں ہے اور جس چیز سے غافل نہیں ہوسکتا وہی انسان کی حقیقی ذات ہے ۔ دوسرے لفظوں میں غافل اور ہے اور مغفول اور ہے ۔ لہٰذا ذات انسان اور ہے اور جسم، جس سے غافل ہوسکتا ہے ، اور ہے

**۲۔صفات انسان:** جسم انسان کے تمام اجزاء تغیر و تبدل کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ جسم انسان ہر سات سال میں مکمل بدل جاتا ہے ۔ اس تغیر و تبدل میں جسم میں نمایاں حالات پیدا ہوتے ہیں۔ صحت، مرض، کمزوری ،قوت ،طفولت، جوانی ، بڑھاپا وغیرہ ۔

اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایسے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں جو ثابت اور لا یتغیر ہیں اور خواہ کتنی ہی جسمانی تبدیلیاں آ جائیں ان اوصاف میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آتی ۔ جیسے محبت، عداوت، شجاعت، سخاوت وغیرہ ۔

انسان کے جسمانی ارتقا و انحطاط اور روحانی ارتقا و انحطاط میں نمایاں فرق ہے بلکہ یہ دو مختلف خطوط پر چلتے ہیں ۔ انسان جوانی میں جسمانی اعتبار سے ارتقا کے آخری درجہ کمال پر فائز ہوتا ہے، لیکن روحانی طور پر کمزور ہوتا ہے اور اس کے بعد جب بڑھاپا شروع ہوتا ہے تو جسمانی طور پر کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے، لیکن فکری اور عقلی طور پر وہ کمال پر فائز ہو جاتا ہے۔

یہاں سے ان دونوں میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے ۔ ایک انحطاط کی طرف جا رہا ہے اور دوسرا کمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔

**وحی اور روح:** سولہویں صدی تک تو مغربی دنیا وحی کی قائل تھی مگر سائنسی ترقی کے بعد وحی کو خرافات میں شمار کرنے لگی اور رفتہ رفتہ وحی کے ساتھ روح کے وجود کی بھی منکر ہو گئی ۔ یوں اس نے وحی اور روح کے انکار کو سائنسی ترقی کا شعار قرار دے دیا۔

لیکن بعد کی تحقیقات کے نتیجے میں وجود روح کے آثار ظاہر ہونے کی وجہ سے نظریہ روح نے دوبارہ قوت حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی وحی کا تصور بھی قابل توجہ قرار دیا۔

**روح کی حقیقت:** روح کی حقیقت اور جسم کے ساتھ اس کے ربط اور تعلق کے بارے میں اب تک کوئی بھی کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا ۔ پھر بھی علم نفسیات اور فزیالوجی کی تحقیقات اور انکشافات نے بہت سی اہم باتوں سے پردہ ضرور اٹھایا ہے ۔اگرچہ ان تحقیقات کا مطمع نظر جسم و روح میں ربط کا انکشاف کرنا نہیں تھا مگر ان تحقیقات سے بعض حقائق از خود سامنے آئے ہیں۔

اسلامی فلسفے میں روح اور حرکت مادہ کا مسئلہ ملا صدر الدین شیرازی نے کافی حد تک حل کر دیا ہے اور اس کے بارے میں بہت سے پیچیدہ مسائل کو قابل فہم بنا دیا ہے۔ صدر الدین شیرازی سے پہلے حرکت صرف مادے کے اوصاف میں ہی منحصر سمجھی جاتی تھی۔ یعنی مادہ صرف کیفیاتی، کمیاتی، مکانی اور محوری حرکت رکھتا ہے۔ لیکن صدر الدین شیرازی نے حرکت جوہری کا اصول روشناس کراتے ہوئے حقیقت مادہ کی حرکت کو ثابت کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں:

جیسا کہ کائنات میں ایک سطحی اور ظاہری محسوس حرکت موجود ہے، اسی طرح

ایک ایسی حرکت بھی موجود ہے جو اس کائنات کی گہرائیوں میں ہے اور محسوس نہیں ہوتی اور یہ کائنات کی جوہری حرکت ہے اور یہ حرکت باقی سب حرکتوں کی اصل او ربنیاد ہے اور اسی حرکت کے نتیجے میں مادی اجسام کی مختلف اقسام وجود میں آتی ہیں۔ روح بھی قانون حرکت کا ایک نتیجہ ہے اور مادہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنی آغوش میں ماورائے مادہ کی پرورش کرے۔ درحقیقت مادہ اور غیر مادہ میں کوئی خاص منافات نہیں ہے اور غیر مادہ درحقیقت مادے کی ارتقائی منازل کا ثمر ہے۔

واضح رہے حرکت سے قطع نظر روح مادے کا نتیجہ نہیں، بلکہ حرکت کا نتیجہ ہے اور حرکت مادے اور روح میں رابطہ ہے۔

ملاّ صدر الدین شیرازی کی ان عظیم علمی تحقیقات کے بعد روح وجسم میں ربط قابل فہم ہو جاتا ہے۔

مادہ پرست روح کو مادے کے اجزا کے باہمی ارتباط کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور روح کو بھی مادے کی خاصیتیں دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملا صدر الدین کے مطابق روح ارتقائے مادہ کی آخری منزل کا ثمر ہے۔ لہٰذا روح مادے سے جدا بھی ہے اور یہ دونوں ایک بھی نہیں ہیں، بلکہ روح مادے کے ساتھ مربوط ہونے کے باوجود اپنا مستقل غیر مادی وجود رکھتی ہے۔

روح کے غیر مادی ہونے پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے صرف ایک ایسی دلیل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو جدید علم نفسیات کی روشنی میں بھی قابل قبول ہے اور فلسفے کی اصطلاحات کی پیچیدگیوں سے بھی صاف ہے۔

**خود آگاہی:** یہ بات سب کے لیے ایک واضح حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کا شعور رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ ''میں موجود ہوں'' اور کائنات میں سب سے واضح حقیقت ہر شخص کے لیے اپنی ذات کا وجود ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ البتہ اس وجود کی تہ تک پہنچنا دوسری بات ہے۔ اس حقیقت کی گہرائیوں کا ادراک کرنے کے لیے تو دلیل اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ مگر اپنی ذات کے وجود کو جاننے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا کبھی کسی کو اس بات پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ ''میں موجود ہوں''۔

اب یہ ''خود'' جو ہر شخص کے لیے واضح ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ مادی ہے یا غیر مادی؟ اس بارے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں:

پہلا نظریہ: مادیت۔

دوسرا نظریہ: نظریہ مابعد الطبیعیات۔

پہلا اس حقیقت کو مادی اور دوسرا غیر مادی سمجھتا ہے۔

مادیت کا نظریہ یہ ہے کہ'' خود'' ایک ثابت شے نہیں ہے بلکہ اس میں ہر آن ایک تسلسل سے تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔

اس نظریے کے حامی کہتے ہیں: یہ کہنا درست ہے کہ'' میں ہوں اور میں نہیں بھی ہوں''۔ وہ اس کے لیے نہر کی مثال پیش کرتے ہیں کہ نہر کا پانی ہر آن بدلتا رہتا ہے اور ہر لحظہ مختلف پانی سامنے آتا ہے۔ اس کے باوجود نہر ایک ہے، لہٰذا وہ ان مسلسل ادراکات کو جو ایک تسلسل کے ساتھ قائم رہتے ہیں'' خود'' کا نام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ''چونکہ انسان اپنی خودی کا ادراک کرتا ہے'' اس لیے'' میں ہوں'' کہنا درست ہے اور کیونکہ یہ'' خودی'' ہر آن بدلتی رہتی ہے، لہٰذا '' میں نہیں ہوں'' کہنا بھی درست ہے۔

**دلیل روح:** مابعد الطبیعیاتی نظریہ یہ ہے کہ'' خود'' اس حقیقت کا نام ہے جو تمام حالات میں موجود رہتی ہے اور ناقابل تغیر ہے۔جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارۃً ذکر کیا گیا ہے کہ اب سائنس میں یہ بات مسلم ہے کہ انسانی جسم کے تمام خلیے بدلتے رہتے ہیں، یوں تقریباً چھ سال میں جسم انسانی کے اکثر خلیے تبدیل ہوجاتے ہیں اس طرح ستر (۷۰) سالہ شخص کا جسم اپنی زندگی میں کئی مرتبہ بدل چکا ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود'' خود'' نہیں بدلتا اور وہ شخص سمجھتا ہے کہ میں وہی ہوں جو آج سے پچاس سال پہلے تھا۔

پس جو بدلتا ہے وہ مادہ ہے یعنی ''جسم''۔

اور جو نہیں بدلتا وہ غیر مادہ ہے یعنی ''روح''۔

**کیا فکر مادی ہے؟** مارکس ازم کا ڈائلکٹیکل میٹریل ازم یعنی جدلیاتی مادیت چونکہ ماورائے مادہ کی نفی کرتی ہے اور ہر مادہ کو متحرک اور متغیر سمجھتی ہے، لہٰذا اس کے نزدیک فکر بھی مادہ ہے اور ہر مادہ ہمیشہ حرکت میں ہے اور کسی مادے میں سکون و جمود نہیں ہے۔ گویا مادہ پرستوں کے نزدیک فکر اور سوچ بھی غیر مادی نہیں بلکہ مادی ہے۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ کیا فکر مادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اس میں تغیر آتا ہے یا نہیں ؟ یا دوسرے لفظوں میں فکری مفاہیم بدلتے ہیں یا نہیں؟

قدیم فلسفی بعض مفاہیم کو دائمی اور بعض کو غیر دائمی جانتے تھے، جب کہ مارکس ازم کے نزدیک کوئی مفہوم دائمی نہیں ہے۔ حالانکہ خود مارکس ازم بعض مفاہیم کو دوام بخشتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ'' مادہ ہمیشہ متحرک ہے اور بدلتا ہے'' تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی مفہوم دوسرے آن میں ذہن میں باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ہم کسی بھی گذشتہ واقعہ کا تصور ایک لمحہ بعد ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ واقعہ اسی آن میں صادق ہوگا جس میں یہ واقع ہوا ہے۔ مثلاً یہ واقعہ کہ مارکس ایک انقلابی شخصیت تھا، صرف اسی وقت میں صادق ہو سکتا ہے جس میں وہ انقلابی تھا۔ اس طرح گذشتہ واقعات کے بارے میں اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً تاریخ

کا مفہوم بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ فکر غیر مادی ہے اور مادہ (مغز و اعصاب) فکر کے لیے آلہ کار ہیں ۔ اگر فکر مادی ہوتی تو مادہ کے خواص اس میں موجود ہونے چاہئیں جب کہ وہ اس میں نہیں پائے جاتے۔

مثلاً مادہ قابل تقسیم ہے لیکن فکر تقسیم نہیں ہوتی ۔ اسی طرح مادے کے اجزا ہو سکتے ہیں، جب کہ فکر کے اجزا نہیں ہوتے۔ اسی طرح مادے کی دیگر خاصیتیں جیسے وزن، جگہ گھیرنا بھی فکر میں نہیں ہوتیں۔

**حافظہ**: دوسری دلیل یہ ہے کہ فکر یا علم و ادراک مادہ ہو تو ہمیشہ تغیر میں رہے۔ لہٰذا جو چیز ایک سال پہلے ذہن میں آئی تھی اسے اب ختم ہو جانا چاہیے تھا اور اگر فکر و ادراک صرف دماغ ہی سے عبارت ہے تو دماغی سیل (خلیے) بدلتے رہتے ہیں اور ان خلیوں کے بدلنے سے فکر و ادراک کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ چونکہ ان خلیوں کے علاوہ یہاں کچھ اور تو ہے نہیں، لہٰذا ایک لمحہ پیشتر فکر میں آنے والی بات دوسرے لمحے میں موجود نہیں ہونی چاہیے ۔حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ بیسیوں سال کی ہزاروں معلومات انسانی دماغ میں محفوظ رہتی ہیں اور اسے حافظہ کہتے ہیں۔

اگر کسی نے بچپن میں اژدھے کو دیکھا ہے تو سالہا سال گزرنے کے بعد بھی اس کی شکل وصورت اس کے ذہن میں محفوظ رہتی ہے اور ہر مناسب وقت پر وہ اژدھا اسے یاد آتا ہے اور یاد آنے پر اژدھے کی صورت ذہن میں دوبارہ حاضر ہو جاتی ہے جب کہ اس وقت دوبارہ اس نے اژدھے کو دیکھا نہیں ہے ۔ دیکھا تو صرف پہلی مرتبہ ہی تھا ۔ اب اس کی صورت اور شکل بن دیکھے ہی ذہن میں حاضر ہو جاتی ہے۔

ماہرین نفسیات اس بارے میں کہتے ہیں کہ انسان خارجی عوامل کے تحت اپنے حواس سے کسی ایک شے کا ادراک کرتا ہے اور بعد میں خارجی عوامل کے بغیر عین اسی چیز کو ذہن میں حاضر کر لیتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں اسے چار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے:

۱۔ ابتدائی حس: یعنی پہلے جب ایک شے حواس میں آ جائے تو پھر اسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو خارج سے اپنے حواس کے ذریعے ایک شے کا ادراک ہوتا ہے۔

۲۔ حفظ: جو چیز ذہن میں وارد ہو جاتی ہے جب تک عیناً وہی چیز ذہن میں باقی نہ ہو، کسی خارجی عامل کے بغیر اس کا دوبارہ ذہن میں آنا ممکن نہیں ہے۔

۳۔ تذکر (یاد آوری): یعنی گذشتہ واقعات کا ذہن میں دوبارہ حاضر کرنا۔

۴۔ تشخص: یعنی اس بات کی تشخیص کرنا کہ یہ بات جو اب یاد آئی ہے عیناً وہی بات ہے جو پہلے کسی وقت ذہن میں آئی تھی۔ دوسری مرتبہ یہ بات خارج سے ذہن میں نہیں آئی اور نہ ہی یہ کوئی نیا خیال ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پہلی بار ذہن میں آنے سے لے کر دوسری مرتبہ یاد

آنے تک وہ بات ذہن میں کیسے محفوظ رہتی ہے اور مناسب وقت پر یاد آنے سے پہلے اس کی نگہداری کیسے ہوتی ہے؟

چنانچہ جدلیاتی مادیت کے حامی کہتے ہیں کہ اس وقت وہ دماغ کے کسی ایک خلیے میں اس طرح محفوظ رہتی ہے جس طرح آواز، کیسٹ میں محفوظ ہوتی ہے اور اس کے محفوظ رہنے کی کیفیت معلوم نہیں ہوسکتی مگر جب دماغ کے ان خلیوں میں تحریک ہوتی ہے تو اس وقت پرانی بات دوبارہ ادراک میں آجاتی ہے۔ یعنی یاد آنا دوسرا ادراک ہے، عیناً پہلا ادراک نہیں ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر پرانی بات دماغی خلیوں ہی میں محفوظ رہتی ہے تو یہ خلیے تو بدلتے رہتے ہیں۔ جن خلیوں میں یہ بات آئی تھی وہ خلیے اب موجود نہیں ہیں۔ یعنی کیسٹ کی وہ ریل اب موجود نہیں ہے، اس کی جگہ دوسری ریل آگئی ہے۔ چنانچہ ستر سالہ شخص کا دماغ کئی مرتبہ بدل چکا ہوتا ہے، اس کے باوجود اسے اپنے بچپن کی باتیں کیسے یاد رہتی ہیں اور کہاں محفوظ رہتی ہیں؟

نیز یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ بیرونی عوامل سے تحریک صرف ان خلیوں ہی میں کیوں ہوتی ہے جن میں معلومات محفوظ ہیں۔ یہ تحریک دوسرے خلیات میں کیوں نہیں ہوتی۔

اگر دماغی خلیے نہ بھی بدلیں پھر بھی انسانی دماغ میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ تمام معلومات اپنے خلیوں میں محفوظ رکھ سکے۔ کیونکہ انسانی دماغ کے خلیوں کی تعداد بارہ ارب سے زائد نہیں ہے، جب کہ سائنسدانوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ انسان اپنے حافظے میں دس لاکھ ارب معلومات محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اب بارہ ارب معلومات تو دماغی خلیوں میں سما سکتی ہیں باقی کہاں محفوظ رہتی ہیں؟

واضح رہے کہ سائنسی طور پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور ثابت ہے کہ چھ سال میں انسانی جسم کے تمام خلیے بدل جاتے ہیں اور نئے خلیے ان کی جگہ لیتے ہیں۔

خود جدلیاتی مادیت کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ ''مادہ ہر آن متحرک رہتا ہے''۔ اس کے حامی کہتے ہیں: خلیات بدلتے ضرور ہے مگر دوسرے خلیے ان کی جگہ لیتے ہیں اور ذہنی معلومات دوسرے خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہیں جیسا کہ نہر کے بہتے ہوئے پانی میں انسان اپنی صورت برابر دیکھتا رہتا ہے جب کہ جس چیز میں وہ اپنی صورت دیکھ رہا ہوتا ہے وہ ہر آن بدلتی رہتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس بات سے تو خود ڈائلکٹیکی قانون قائم نہیں رہتا، کیونکہ یہ لوگ ذہنی معلومات کے بدلنے کے قائل تھے۔ اب کہتے ہیں کہ پانی میں نظر آنے والی تصویر کی طرح فکر بدلتی نہیں ہے۔

یہ مثال ایک شاعرانہ مثال تو ضرور ہے مگر حقیقت سے اس مثال کا کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جاری پانی میں ہم اپنی صورت کو ساکن اس لیے دیکھتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے خیالی ادراک میں باقی ہے، ورنہ حقیقت

میں مختلف صورتیں یکے بعد دیگر ے بلا فاصلہ دیکھنے میں آتی ہیں اور فاصلہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا خیال اسے ایک ہی صورت سمجھتا ہے جس طرح پردے پر نمودار ہونے والی فلمی تصاویر ایک ہی صورت کی طرح ہمیں دکھائی دیتی ہیں جب کہ درحقیقت یہ متعدد تصاویر ہوتی ہیں ،جن کے یکے بعد دیگرے آنے کی وجہ سے ہم انہیں ایک تصویر سمجھتے ہیں۔

**مادیت کی سب سے بڑی دلیل:** فکر وادراک کے مادی ہونے کی مارکس ازم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر فکر مادی نہ ہوتی تو دماغ پر پڑنے والے اثرات سے متاثر نہ ہوتی حالانکہ دماغ پر پڑنے والے اثرات فکر کو براہ راست متاثر کرتے ہیں ، جن کی وجہ سے دماغی امراض سے حافظہ ختم ہو جاتا ہے ۔جنگوں میں دماغی صدمہ سہنے والے چند افراد جب اپنے وطن واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے شہر اور اپنے ماں باپ کو نہیں پہچانا، حتیٰ کہ وہ اپنا نام تک بھول چکے تھے، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فکر مادہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فکر اگرچہ غیر مادی ہے اور علم وادراک ماورائے مادہ میں محفوظ ہوتے ہیں مگر یاد آوری ایک عمل ہے اور یہ بات اسلامی فلسفے میں واضح ہے کہ روح اپنے عمل میں آلہ و اوزار کی محتاج ہے۔ لہٰذا فراموشی خواہ درازی مدت کی وجہ سے ہو یا دماغی خلل کی وجہ سے، اس سے ذہنی معلومات بالکل ختم نہیں ہوتیں بلکہ اپنے آلۂ عمل کے فقدان کی وجہ سے روح ان معلومات کو صفحہ ذہن پر دوبارہ حاضر کرنے سے عاجز ہوتی ہے ۔اس کی دلیل یہ ہے کہ جب دماغی امراض کا علاج معالجہ ہوتا ہے او رآلات کار درست ہو جاتے ہیں تو روح دوبارہ پرانی معلومات کو صفحہ ذہن پر حاضر کرسکتی ہے اور معلومات کا یہ عود کر آنا اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب پرانی معلومات ذہن میں موجود ہوں۔

جدید ماہرین نفسیات نے بھی اس بات کی تائید کر دی ہے کہ معلومات ذہن سے مٹ نہیں جاتیں بلکہ انہیں دوبارہ ذہن میں حاضر کرنے (یاد کرنے) کی قوت روح سے سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ متعدد نفسیاتی تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ بعض حالات میں جب روح پر غیر معمولی دباؤ پڑتا ہے تو بہت سے فراموش شدہ واقعات یاد آجاتے ہیں۔

کچھ حضرات نے تو یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انسان کو نزع روح کے وقت زندگی کے تمام واقعات یا آجاتے ہیں۔

**مادے کے اوصاف اور فکر:** فکر کے غیر مادی ہو نے پر ایک واضح دلیل یہ ہے کہ مثلاً ایک باغ ہے جس کا طول ایک سو میٹر اور عرض بھی ایک سو میٹر ہے اور زید نے اسی باغ کا مشاہدہ کیا ۔ مشاہدے کے بعد اس باغ کی تصویر اس کے ذہن میں نقش ہوگئی یعنی زید کی فکر میں باغ موجود ہے۔ باغ کا مادی وجود 100 x 100 میٹر ہے لیکن ذہن میں باغ کا غیر مادی وجود یعنی اس کا علم و ادراک 100 x 100

میٹر نہیں ہے بلکہ اس علم و ادراک کا کوئی طول و عرض نہیں ہے، یعنی مادی نہیں ہے۔

چند روسی دانشور اپنی کتاب ''جدلیاتی مادیت'' میں لکھتے ہیں:

> احساس، ادراک، تصور اور فکر ایسے امور ہیں جنہیں نہ دیکھنا ممکن ہوتا ہے، نہ سونگھنا، نہ چھونا اور نہ ہی ان کی آواز سننا۔ فکر کو ہم کسی زمان و مکان کی حدود میں نہیں دیکھ سکتے۔ نہ اس کا طول و عرض ہوتا ہے اور نہ وزن۔ دوسرے مادی اجسام کی طرح فکر و ادراک میں فزیکل خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔

**ادراک اور روح:** اگر ادراک صرف اعصابی عمل اور خارجی عوامل سے عبارت ہے، بہ الفاظ دیگر ادراک اگر آواز کی اعصاب کے ذریعے دماغ تک رسائی کا نام ہے تو جب بھی اعصاب کے ذریعے آواز دماغ تک پہنچ جائے، ادراک وجود میں آنا چاہیے، حالانکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی بات میں منہمک ہو تو اسے دیگر آوازوں کا ادراک ہی نہیں ہوتا جب کہ آواز کا ارتعاش اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ روح متوجہ نہیں ہوتی۔ پس ادراک کرنے والی درحقیقت روح ہوتی ہے جب کہ اعصاب و دماغ فقط ذریعۂ ادراک ہیں۔

**زمان اور ادراک:** ادراک کے غیر مادی ہونے پر ایک دلیل یہ ہے کہ ادراک زمانے کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ ادراک صفحۂ ذہن پر دوبارہ تکراراً وجود میں آتا ہے اور جو چیز زمانی ہو وہ کبھی تکرار نہیں ہوتی۔ جو وقت درکار ہوتا ہے وہ خود ادراک کے لیے نہیں بلکہ آلۂ ادراک کے لیے درکار ہوتا ہے۔

**سچے خواب:** خواب میں انسانی روح اپنے طبیعیاتی عمل سے استفادہ کیے بغیر از خود سماعت و بصارت کی قوت رکھتی ہے۔ خواب کی حالت میں انسان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، کانوں سے کوئی آواز نہیں ٹکراتی، اس کے باوجود جو کچھ اس نے خواب میں دیکھا اور سنا وہ سچا ہوتا ہے۔

**وحی کا ادراک:** رسول کریم (ص) کے لیے وحی کا ادراک ایک وجدانی کیفیت ہے، جس میں شک و تردید، اشتباہ اور غلطی کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا، کیونکہ رسول کریم (ص) وحی کو حواس ظاہری مثلاً بصارت و سماعت جیسے جائز الخطاء ذرائع سے نہیں لیتے تھے، اگرچہ رسول کریم (ص) کے ظاہری حواس بھی جائز الخطاء نہیں تھے، تاہم یہ ذرائع تو سب کے پاس موجود ہیں، بلکہ آپ (ص) وحی کو عینی مشاہدے اور محسوسات سے زیادہ واضح طور پر اپنے پورے وجود کے ساتھ درک کرتے تھے، جیسا کہ عام انسان اپنے وجود، اپنے شعور اور اپنے وجدانیات میں شک و تردید کا شکار نہیں ہوتے۔ رسول کریم (ص) کے لیے وحی کا مسئلہ اس سے واضح تر تھا۔ اگرچہ بفرض محال کبھی کبھار کوئی عاقل انسان اپنے وجود کے بارے میں کسی شک و تردید کا شکار ہو بھی سکتا ہو مگر رسول کریم (ص) وحی کے بارے میں کبھی بھی کسی شک و شبہے میں نہیں پڑے۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ [1]

جسے روح الامین نے اتارا آپ کے قلب پر تا کہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

نیز ارشاد ہوا

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ [2]

پھر اللہ نے اپنے بندے پر جو وحی بھیجنا تھی وہ وحی بھیجی، جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا تو کیا جسے انہوں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھا ہے تم لوگ (اس کے بارے میں) ان سے جھگڑتے ہو؟

**تعریف قلب:** انسان کے اندر مختلف پہلو اور متعدد جہات ہیں اور یہ تمام جہتیں ایک ہی مرکز سے مربوط ہیں۔ حتیٰ کہ عقل بھی انہی جہات میں سے ایک ہے۔ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مرکز سے مربوط رہے۔ اس مرکزی قوت کو قرآن نے قلب کہا ہے۔ قلب یعنی نفس اور روح۔

پس قلب رسولؐ پر وحی نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وحی کا ادراک رسول کریم (ص) علم حضوری کے طور پر اپنے وجود سے کرتے تھے، نہ کہ محسوسات کی طرح صرف حواس خمسہ سے اور نہ ہی معقولات کی طرح صرف عقل سے، بلکہ ان دونوں سے واضح تر اپنے پورے وجود سے وحی کو حاصل کرتے تھے، یعنی رسول کریم (ص) کو جس طرح اپنے وجود کا ادراک ہوتا تھا اس سے بھی واضح اور بیّن طور پر وحی کا ادراک ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰ (ع) پر ابتدا میں جب وحی نازل ہو رہی تھی اس وقت حضرت موسیٰ (ع) کو بتایا گیا کہ یہ وحی اللہ کی جانب سے ہے:

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ... [3]

اور میں نے آپ کو منتخب کر لیا ہے لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے اسے سنیں، میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں....

نیز اس بات کو باور کرانے کے لیے کہ وحی اللہ کی طرف سے ہے اور حضرت موسیٰ (ع) کو رسول بنایا جا رہا ہے۔ پہلے خود حضرت موسیٰ (ع) کو دو نشانیاں دکھائی گئیں: عصا کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا۔

لیکن حضور ختمی مرتبت (ص) پر ابتدا میں جب وحی نازل ہوئی تو شواہد و آیات کی ضرورت پیش نہ آئی بلکہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوئی، صرف حکم نازل ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ... [4]

پڑھیے! اپنے پروردگار کے نام سے۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ بات کرنے والے کو مخاطب اگر نہیں جانتا تو بات کرنے والا پہلے اپنا تعارف

---

[1] ۲۶ شعراء: ۱۹۳۔۱۹۴ [2] ۵۳ نجم: ۱۰ تا ۱۲ [3] ۲۰ طٰہٰ: ۱۳۔۱۴ [4] ۹۶ علق: ۱

کراتا ہے، پھر بات شروع کرتا ہے اور اگر بات کرنے والا مخاطب کے سامنے ہمیشہ حاضر ہے تو تعارف کے بغیر حکم کر دیتا ہے۔

حضرت علی(ع) سے روایت ہے:

وَ لَمْ یَجْمَعْ بَیْتٌ وَاحِدٌ یَوْمَئِذٍ فِی الْاِسْلَامِ غَیْرَ رَسُولِ اللّٰہِ وَ خَدِیجَۃَ وَ اَنَا ثَالِثُھُمَا اَرَی نُورَ الْوَحْیِ وَ الرِّسَالَۃِ وَ اَشُمُّ رِیحَ النُّبُوَّۃِ وَ لَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّۃَ الشَّیْطَانِ حِیْنَ نَزَلَ الْوَحْیُ عَلَیْہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔[1]

اس وقت اسلام کے زیر سایہ ایک گھر میں رسول اللہؐ اور خدیجہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور میں ان میں تیسرا شخص تھا۔ وحی و رسالت کے نور کا مشاہدہ کرتا اور نبوت و رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ میں نے حضور (ص) پر وحی نازل ہوتے وقت شیطان کی چیخ سن لی۔

**اقسام وحی: ۱۔ خواب:** وحی سچے خواب سے شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امیر المؤمنین (ع) سے روایت ہے:

رؤیا الانبیاء وحی۔[2]

انبیاء کے خواب وحی ہیں۔

البتہ قرآن خواب کی صورت میں نازل نہیں ہوا۔

**۲۔ جبرئیل:** حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ان جبرائیل کان اذا اتی النبی صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم لم یدخل علیہ حتی یستأذنہ ، فاذا دخل علیہ قعد بین یدیہ قعدۃ العبد۔[3]

جب جبرائیل رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اجازت لے کر داخل ہوتے اور داخل ہونے کے بعد آپ کے سامنے ایسے بیٹھ جاتے جیسے ایک غلام بیٹھتا ہے۔

**۳۔ براہ راست:** قلب رسالتمآب پر وحی اکثر براہ راست نازل ہوا کرتی تھی اور جب آپ (ص) براہ راست اللہ سے ہمکلام ہوتے تو آپ (ص) کا رنگ متغیر ہو جاتا، آپ پر غشی طاری ہو جاتی اور پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ جو لوگ اس وقت حضور (ص) کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان پر بھی ایک عجیب سی ہیبت طاری ہو جاتی اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہتے۔

ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا○[4]

عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

نزول وحی کے دوران حضور اکرم (ص) جس حالت استغراق میں ہوتے اس سے دشمنان اسلام، بالخصوص مستشرقین نے آپ (ص) کی رسالت کو مشتبہ بنانے کی ناکام کوشش کی اور کہا کہ حضور (ص) نعوذ باللہ مرگی کی بیماری میں مبتلا تھے اور جب آپ (ص) کو اس بیماری کا دورہ پڑتا تو ہوش اور شعور سے محروم ہو جاتے،

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ ص ۵۳۴ [2] الامالی للطوسی ص ۳۳۸
[3] بحار الانوار ۱۸: ۲۶۰۔ کمال الدین۔ للشیخ الصدوق ۱: ۸۵ [4] ۷۳ مزمل: ۵

پسینے میں شرابور ہو جاتے اور جب ہوش میں آتے تو اپنے مریدوں سے کہتے کہ مجھ پر وحی نازل ہو رہی تھی اور انہیں کچھ باتیں سنا دیتے تھے۔

و شھد شاھد من اھلھا کے مصداق خود مستشرقین میں سے ایک شخص ان کی اس شرارت کا جواب اس طرح دیتا ہے: چنانچہ سرولیئم میور (Sir William Muir) اپنی کتاب ''حیات محمد'' (Life of Mohammad) میں لکھتے ہیں:

> وحی کی جو کیفیت محمد پر طاری ہو جاتی تھی اس کی غلط توجیہ کرنا علمی اور سائنسی لحاظ سے ایک فاش غلطی ہے کیونکہ جب مرگی کے مرض کا دورہ پڑتا ہے تو اس اثنا میں قوت حافظہ سرے سے کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور مریض کو کچھ یاد نہیں رہتا کہ اس دوران اس پر کیا گزری، کیونکہ اس حالت میں فکر و شعور ماند پڑ جاتے ہیں ۔ یہ وہ باتیں ہیں جو اس مرض کے بارے میں سائنس کی مدد سے معلوم ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک بات بھی رسول کریم (ص) کو اثنائے وحی عارض نہیں ہوتی تھی ، بلکہ اس دوران ان کے پورے حواس بطور احسن کام کرتے تھے اور پھر جو وحی نازل ہوتی تھی اسے اپنے اصحاب کے لیے بیان کرتے تھے۔[1]

**آغاز وحی:** اس بات میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں کہ قرآن کا نزول ماہ مبارک رمضان کی شب قدر میں ہوا ہے جیسا کہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ... [2]

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

لیکن یہاں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

۱۔ علمائے امامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسالتمآب(ص) ماہ رجب میں مبعوث بہ رسالت ہوئے۔ آغاز وحی اور آغاز بعثت مختلف اوقات میں کیسے قابل تصور ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آغاز وحی اور بعثت کا ایک ہی وقت میں ہونا ضروری نہیں، عین ممکن ہے کہ وحی کے نزول کا سلسلہ پہلے شروع ہو چکا ہو اور ابھی مبعوث بہ رسالت نہ ہوئے ہوں. چنانچہ نزول قرآن اور بعثت کے درمیان ایک وقفہ موجود تھا۔ اس دوران آپ (ص) پر وحی نازل ہوتی تھی مگر تبلیغ کا حکم بعد میں ملا ۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ (ص) کو تبلیغ رسالت کا حکم ملا:

---

[1] بحوالہ تاریخ القرآن از محمد حسین علی الصغیر ص ۲۱ [2] ۲ بقرہ: ۱۸۵

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○[1]

آپ کو جس چیز کا حکم ملا ہے اس کا واشگاف الفاظ میں اعلان کریں اور مشرکین کی اعتنا نہ کریں۔

۲۔ قرآن کا نزول تیئیس (۲۳) سالوں پر محیط ہے تو قرآن کا صرف ایک رات میں نازل ہونے کا مطلب کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن قلب رسول (ص) پر شبِ قدر میں نازل ہوا ہے یعنی رسول کریم (ص) کو علم قرآن بیک وقت دیا گیا۔ البتہ قرآنی آیات کی تبلیغ و ارشاد کے لیے بذریعہ وحی تازہ احکامات مل جایا کرتے تھے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ○[2]

اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے رکھا ہے تا کہ آپ اسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ شب قدر میں نزول قرآن کا مطلب آغازِ نزول ہے۔ چنانچہ ہر اہم واقعے کا آغاز بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔

**مکی و مدنی آیات:** آیات اور سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ اس بارے میں تین نظریات ہیں:

۱۔ مدینہ پہنچنے سے پہلے نازل شدہ آیات اور سورتیں ''مکی'' ہیں جب کہ مدینہ پہنچنے کے بعد کی آیات اور سورتیں ''مدنی'' ہیں۔

اس نظریے کے مطابق ہجرت سے پہلے نازل شدہ آیات خواہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا غیر مکہ میں یا اثنائے ہجرت میں مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی ہوں، سب ''مکی'' قرار پائیں گی اور مدینہ پہنچ جانے کے بعد نازل شدہ آیات ''مدنی'' قرار پائیں گی، خواہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں یا سفر میں یا جنگوں میں، حتیٰ کہ فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر خود مکہ میں نازل شدہ سورتیں بھی ''مدنی'' قرار پائیں گی۔

۲۔ جو آیات و سورتیں مکہ اور اس کے آس پاس (خواہ ہجرت کے بعد) نازل ہوئی ہوں وہ ''مکی'' ہیں اور جو مدینہ اور اس کے آس پاس نازل ہوئی ہوں وہ ''مدنی'' ہیں اور جو ان دونوں شہروں سے دور دوسرے علاقوں میں نازل ہوئی ہیں، وہ نہ ''مکی'' ہیں نہ ''مدنی''۔

۳۔ جن آیات کے مخاطب اہل مکہ ہیں وہ ''مکی'' ہیں اور جن آیات میں مدینہ والوں سے خطاب ہے وہ ''مدنی'' ہیں۔ مکہ میں نازل ہونے والی آیات کا آغاز یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ سے

---

[1] ۱۵ حجر: ۹۴ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۱۰۶

ہوتا ہے کیونکہ اکثر اہل مکہ کافر تھے، جب کہ مدینہ میں نازل ہونے والی آیات کا آغاز يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ہوتا ہے۔ کیونکہ مدینہ والوں میں ایمان والوں کی اکثریت تھی۔

آیات کے مکی و مدنی ہونے کے لیے جو معیار بنائے گئے ان میں مختلف نظریات قائم ہونے سے متعدد آیات کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ بہرحال محققین کے نزدیک پہلا نظریہ صائب اور قریب بہ حقیقت ہے۔

**وحی اور خطا و نسیان:** جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، وحی کا ادراک رسول کریم (ص) کے لیے ایک ایسی وجدانی کیفیت ہے جس میں کسی شک و تردید اور غلطی و اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ رسول کریم (ص) عینی مشاہدہ سے بالاتر اپنے پورے وجود کے ساتھ وحی کو درک کرتے تھے۔ اس لحاظ سے رسول کریم (ص) معصوم عن الخطا ہیں۔ اگر کسی صورت بھی غلطی کی گنجائش رہ جاتی تو وحی پر سے بالعموم اور قرآن پر سے بالخصوص اعتماد اٹھ جاتا۔ عدم خطاء کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۝[1] ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

**داستان غرانیق:** طبری نے اپنی تفسیر اور جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور ۴: ۳۶۶۔ ۳۶۸) میں اور دیگر علمائے اہل سنت نے صحیح السند روایات میں ذکر کیا ہے:

> رسول کریم (ص) مشرکین مکہ کے ساتھ کعبہ کے پاس بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ کاش قرآن میں کوئی ایسا مطلب نازل ہو جائے جس سے قوم میرے نزدیک آ جائے۔ چونکہ رسول اللہ (ص) کو اپنی قوم سے قطع تعلقات پر دکھ تھا اور چاہتے تھے کہ قربت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اتنے میں سورہ نجم نازل ہوئی۔ آپ (ص) اسے تلاوت فرمانے لگے۔ جب یہاں پہنچے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟ اور

وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝[2] پھر تیسرے منات کو بھی۔

تو شیطان نے آپ (ص) کے ذہن میں درج ذیل الفاظ ڈال دیے:

تلك الغرانيق العلى و ان شفاعتهن لترجى۔ ایسے بلند مرتبہ بت ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے۔

رسول کریم (ص) نے قریش کے سامنے ان کی تلاوت فرمائی۔ بعد میں آپ (ص)

---

(۱) ۸۷ اعلیٰ: ۶ (۲) ۵۳ نجم: ۱۹۔۲۰

نے سجدہ کیا۔ آپ (ص) کے ساتھ مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرکین نے بھی سجدہ کیا اور آپ (ص) کی طرف سے اپنے خداؤں کی تعظیم وتکریم پر وہ بہت خوش ہوئے۔ مہاجرین حبشہ تک جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی واپس مکہ چل دیئے۔ جب رات ہوئی تو جبرئیل نازل ہوئے اور سورہ پڑھنے کا حکم ہوا۔ آپ (ص) نے ان دونوں کلمات کی بھی تلاوت کی۔

جبرئیل نے کہا: یہ دونوں کلمات آپ (ص) کہاں سے لے آئے؟ اس پر رسول اللہ (ص) کو سخت ندامت ہوئی کہ اللہ پر کذب و افترا ہو گیا۔ اس پر سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ [1]

اور (اے رسول) یہ لوگ آپ کو اس وحی سے منحرف کرنیکی کوشش کر رہے تھے جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے تا کہ آپ وحی سے ہٹ کر کوئی اور بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کریں، اس صورت میں وہ ضرور آپ کو دوست بنا لیتے۔

اس سے رسول اللہ (ص) کو بہت زیادہ رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ [2]

اور (اے محمد) آپ سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ نبی مگر جب اس نے (کامیابی کی) تمنا کی تو شیطان نے اس کی اس آرزو میں خلل اندازی کی لیکن اللہ شیطان کے خلل کو نابود کرتا ہے پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے اور اللہ بڑا دانا، حکمت والا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر طبری ۱۷: ۱۳۱۔۱۳۴۔ درمنثور ۴: ۳۶۶۔۳۶۸۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری ۸: ۳۳۲

اس خود ساختہ داستان کو دشمنان اسلام، خاص طور سے مستشرقین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسالتمآب (ص) کی عصمت کو مخدوش اور دین اسلام کو مطعون کرنے کے لیے اسے خوب اچھالا۔ [3]

حالانکہ یہ داستان عقل و نقل کے اعتبار سے نہایت ہی نا قابل توجہ اور سراسر کذب و بہتان پر مبنی ہے۔ ذیل میں ہم اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں:

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۷۳ [2] ۲۲ حج: ۵۲ [3] بروکلمین کی تاریخ، عربی ترجمہ ص ۳۴

۱۔ داستان خود صریحاً قرآن کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝[1]

وہ خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔

نیز ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ... [2]

جو میرے بندے ہیں ان پر یقیناً تیری (یعنی شیطان کی) بالادستی نہ ہوگی۔

نیز فرمایا:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ [3]

(اے رسول) کہہ دیجیے: مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اسے بدل دوں، میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔

۲۔ یہ روایت زیادہ تر تابعین سے منقول ہے۔ اصحاب میں سے صرف حضرت ابن عباس کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے اور ابن عباس بھی ہجرت سے صرف تین سال قبل پیدا ہوئے تھے، لہٰذا وہ بھی اس واقعے کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے۔

۳۔ یہ عصمت رسول (ص) کے خلاف ہے جو اجماع مسلمین سے ثابت ہے۔

۴۔ آیات کا سیاق وسباق ان کلمات اور اس داستان کے خلاف ہے۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ [5]

بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟ اور پھر تیسرے منات کو بھی؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں؟ یہ تو پھر غیر منصفانہ تقسیم ہے۔[4] دراصل یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے گھڑ لیے ہیں اللہ نے تو اس کی کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔ یہ لوگ صرف گمان اور خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے۔

---

[1] ۵۳ نجم: ۳۔۴ [2] ۱۵ حجر: ۴۲ [3] ۱۰ یونس: ۱۵

[4] یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عرب ان بتوں کو تو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اپنی بیٹیوں کو ننگ و عار سمجھ کر زندہ دفن کر دیتے تھے۔

[5] ۵۳ نجم: ۱۹ تا ۲۳

بھلا درج بالا سیاق وسباق کے ربط میں اس عبارت کا کوئی جوڑ ہے کہ ''یہ تو بہت بلند وبالا بت ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے۔'' حالانکہ ان آیات میں تو ان بتوں کی مذمت موجود ہے۔

تعجب کا مقام ہے کہ ان تمام امور کے باوجود عصمت قرآن اور عصمت رسول (ص) کے منافی اس روایت کو ابن حجر نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری کی جلد ۸ص ۳۳۳ پر صحیح تسلیم کیا ہے اور لکھتے ہیں:

> سعید بن جبیر کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا منقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ براین یہ ایک طریقے سے مستقلاً بسند صحیح بھی نقل ہوا ہے.

اسی طرح امام الفقة و التفسیر طبری نے اپنی تفسیر میں سورہ حج آیت ۵۲ کے ذیل میں اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ امام جصاص اور زمخشری نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ اس روایت کے کذب پر خود اس کے اندر بڑے شواہد موجود ہیں۔

چونکہ روایت کے مطابق سورہ نجم ہجرت حبشہ کے زمانے میں نازل ہوئی۔ ہجرت حبشہ سنہ ۵ نبوی میں واقع ہوئی ہے اور اس روایت میں ذکر ہوا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت سے رسول اللہ (ص) کی سرزنش کی گئی ہے اور سورہ بنی اسرائیل ظاہر ہے معراج کے موقع پر نازل ہوئی ہے اور معراج نبوت کے گیارہویں سال واقع ہوا ہے اور سورہ حج مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کے نزول کے زمانوں اور داستان غرانیق میں تضادات موجود ہیں

اس خودساختہ داستان نے رشدی جیسے شاتم رسول کے لیے ماخذ فراہم کیا ہے۔ فتنۂ رشدی کے بعد مسلمانوں کو اس ضمن میں سوچنا چاہیے کہ شان رسالت (ص) کے منافی مواد کے بارے میں انہیں متحدہ موقف اختیار کرنا ہوگا اور احادیث کے رد وقبول کے سلسلے میں اس صدی کے مسلمان دماغوں کو سوچنے، تحقیق کرنے اور فیصلہ کرنے کا حق دینا ہوگا، ورنہ رشدی جیسے شاتم رسول کو یاوہ گوئی کا موقع ملتا رہے گا۔

# معجزہ

تعریف ۔ معجزے کی ضرورت۔ قرآن ابدی معجزہ ۔ قرآن کا چیلنج۔
چیلنج کا رخ۔ قرآن کا علمی چیلنج ۔ قرآن کا رسالتی چیلنج۔ قرآن کا تنظیمی چیلنج ۔
قرآن کا دعویٰ۔ بلاغتِ قرآن۔ دعوتِ فکر۔ آفاق میں تفکر و تعقل ۔ آسمانوں کے
بارے میں غور و فکر ۔ طریقہ غور و فکر ۔ قرآن کا طرز استدلال ۔ تعقل اور
جذبات و احساسات کا امتزاج۔ قرآن کا طرز استدلال

قرآن مجید وہ کلامِ الٰہی ہے جسے رسول خاتم (ص) پر ایک ابدی شریعت کے ساتھ نازل کیا گیا۔ یہ دائمی سعادت کا بشارت دہندہ، ایک احسن نظام کے لیے اساس اور انسانیت کو اس کا کھویا ہوا مقام دلانے کے لیے ایک درس انقلاب ہے۔

قرآن مجید کے لا تعداد پہلو ہیں اور ہر پہلو خود ایک ابدی معجزہ ہے۔ معجزہ کیا ہے اور اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس باب میں ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

**تعریف:** معجزے کی یہ تعریف کی گئی ہے:

أن يأتي المدعي لمنصب من المناصب الالهية بما يخرق نواميس الطبيعة ، ويعجز عنه غيره، شاهداً على صدق دعوٰه۔[1]

کسی الٰہی منصب کا دعویدار اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے قوانین طبیعت کو توڑ کر ایسا عمل انجام دے جس سے دوسرے لوگ عاجز ہوں۔

اس تعریف کے مطابق معجزے کے لیے درج ذیل امور ضروری ہیں، ورنہ وہ معجزہ نہیں ہوگا:

۱۔ یہ عمل الٰہی منصب کا دعویٰ رکھنے والے سے صادر ہو۔ اگر کوئی اور شخص ایسا عمل انجام دیتا ہے جسے جہالت کی وجہ سے دوسرے لوگ انجام نہیں دے سکتے تو یہ معجزہ نہ ہوگا۔

۲۔ معجزہ کے لیے لازم ہے کہ قوانین طبیعت کے مطابق نہ ہو، کیونکہ اگر طبیعی قوانین کے مطابق کوئی عمل سرانجام پاتا ہے تو یہ بھی معجزہ نہ ہوگا۔

۳۔ دوسرے لوگ اس قسم کا عمل سرانجام دینے سے عاجز ہوں۔ لہٰذا اگر کوئی تجربہ فطری قوانین کے تحت طبیعت کو مسخر بنا دے تو یہ معجزہ نہ ہوگا۔ خود قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے:

---

[1] البیان فی تفسیر القرآن ۔ امام خوئی دام ظلہ ص ۳۳

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً[1]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں کامل کر دی ہیں۔

**معجزے کی ضرورت:** انسانی ہدایت کے لیے رسولوں کا مبعوث ہونا از روئے عقل و نقل ضروری ہے اور جب تک انبیاء کے پاس اپنے دعوے پر شاہد کے طور پر ایک مضبوط اور ٹھوس دلیل نہ ہو لوگ انہیں قبول نہیں کرتے اور اللہ کی طرف سے اتمام حجت بھی نہیں ہوتی۔

چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان نبوت فرمایا:

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝[2]

اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

تو فرعون نے دلیل مانگی:

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝[3]

(فرعون نے) کہا: اگر تم سچے ہو اور کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اسے پیش کرو۔

ظاہر ہے کہ وہ نشانی اور حجت معجزے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ دلیل اگر عاجز کر دینے والی (معجزہ) نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دوسرے لوگ بھی ایسی ہی دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ یوں ہر شخص کے لیے دعویٰ نبوت کرنا آسان ہو جائے گا اور اگر یہ دلیل صرف معجزہ میں منحصر ہو جائے تو جھوٹے دعویداروں کی قلعی کھل جائے گی۔

دوسری طرف ہدایت الٰہیہ اور خدائی دعوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان عقائد و نظریات، روایات و عادات اور مذاہب و دیانات کو ترک کر دیں جو ابّاً عن جدٍّ انہیں وراثت میں ملی ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں کہ کسی کے کہنے پر لوگ مروجہ عادات و رسوم ترک کر کے کوئی اور عمل سرانجام دیں۔

پھر انبیاء علیہم السلام کی طرف سے دعوت جبر و اکراہ کے ساتھ نہیں ہوتی کیونکہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[4]، نہ ان جدید نظریات کو طاقت کے ذریعے مسلط کیا جاتا ہے، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ[5]، بلکہ انبیاء کی دعوت دلیل و منطق کے ساتھ محبت اور ہمدردی پر مبنی ہوتی ہے۔ نبیؐ لوگوں کی ایذا رسانی کے جواب میں انتقام کی بجائے دعائے ہدایت کرتا نظر آتا ہے:

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون[6]

اے اللہ! میری قوم کی ہدایت فرما کہ یہ جانتے نہیں۔

---

[1] ۳۱ لقمان: ۲۰ [2] ۷ اعراف: ۱۰۴ [3] ۷ اعراف: ۱۰۶
[4] ۲ بقرہ: ۲۵۶۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ [5] ۸۸ غاشیہ: ۲۲۔ آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔
[6] منقول ہے کہ کفار قریش کی طرف سے ایذا رسانی پر حضرت رسول اکرم (ص) یہ جملے ارشاد فرماتے تھے۔ بحار الانوار ۳۵: ۱۷۷

چونکہ یہ تو عقائد ونظریات کا معاملہ ہے جو دلوں سے مربوط ہے۔ اگر جسموں پر تسلط ہو بھی جائے تو بھی نظریات دل میں جاگزیں نہیں ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انبیاءؑ اپنے دعوے کی سچائی کے لیے معجزہ پیش کریں۔

**قرآن ابدی معجزہ:** قدیم امتیں عقل وفہم کے لحاظ سے اس قابل نہ تھیں کہ انہیں ایک ابدی شریعت کا امین بنایا جائے۔ وہ صرف محسوسات کے ادراک کے قابل تھیں۔ اس لیے وہ لوگ اپنے معبود کو بھی محسوس یعنی بت کی شکل میں لاتے تھے۔ ان کی طرف انبیاء بھیجے گئے تو انہیں جو معجزے دیئے گئے وہ بھی محسوس معجزات تھے۔ عصائے موسیٰ (ع)، ید بیضا، شق دریا اور مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ محسوس معجزات تھے۔

انسانیت جب عقل و ادراک کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس قابل ہو گئی کہ ایک ابدی شریعت اور دائمی دستور حیات کی امین بنائی جائے تو اسے جو معجزہ قرآن کی شکل میں دیا گیا، وہ معجزہ بھی ہے، ہدایت و رحمت بھی ہے اور شفا بھی اور ساتھ ایک نظام حیات بھی۔

معجزے کی اہمیت وعظمت دعوے کی اہمیت وعظمت سے مربوط ہے۔ ان دونوں میں تناسب بھی ضروری ہے۔ اگر دعویٰ محدود ہے تو معجزہ بھی محدود ہی ہوگا۔ اگر دعویٰ وقتی ہے تو معجزہ بھی وقتی ہوگا۔ لیکن اگر دعویٰ ابدی ہے تو معجزہ بھی ابدی ہوگا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ (ع) کو اپنے دور کا معجزہ دیا گیا۔ یعنی سحر وساحری کا توڑ۔ حضرت عیسیٰ (ع) کو ان کے زمانے کا معجزہ دیا گیا یعنی طب ومسیحائی۔ مگر چونکہ ان کے دعوؤں میں ابدیت نہ تھی، اس لیے ان کا معجزہ بھی انہی کے زمانے تک محدود تھا۔

لیکن رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت ایک ابدی اور ہمہ گیر رسالت تھی، اس لیے آپ (ص) کو ایسا معجزہ عطا ہوا جو کسی حد بندی میں محدود نہیں۔ لہٰذا معجزۂ رسول (ص) یعنی قرآن افراد، زمان، مکان اور موضوع کے اعتبار سے جامع، ہمہ گیر اور ابدی ہے۔ دیکھیے:

۱۔ افراد کے اعتبار سے صرف ایک قوم یا ایک گروہ ہی نہیں بلکہ ہر فرد بشر قرآن کا مخاطب ہے اس میں مذہب، زبان اور رنگ ونسل کا کوئی لحاظ نہیں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ...[1]

کہہ دیجیے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

اور قرآن کہتا ہے:

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝[2]

اور (اے محمد) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

---

[1] ۷/ اعراف: ۱۵۸ [2] ۲۱/ انبیاء: ۱۰۷۔

۲۔ زمانے کے اعتبار سے قرآن اپنے نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک دستور انسانیت ہے:

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ[1]

اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

۳۔ مکانی اعتبار سے بھی ہر مقام اور خطے کے انسان دعوتِ قرآن کے مخاطب ہیں۔ خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، آسمان میں ہوں یا زمین میں اور اس کرہ زمین پر ہوں یا کسی سیارے پر۔ ارشاد ہوا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝[2]

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے فقط بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۴۔ موضوع کے اعتبار سے بھی قرآن انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ایک جامع نظام حیات عطا کرتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ...[3]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی بنا کر نازل کی ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ...[4]

ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔

لہٰذا جہاں رسول کریم(ص) نے ایک جامع، ابدی اور ہمہ گیر دین کا دعویٰ کیا ہے، وہاں اسی مناسبت سے ایک جامع، ابدی اور ہمہ گیر معجزہ درکار تھا جو آپ(ص) نے پیش فرمایا ہے اور وہ معجزہ ہے قرآن مجید۔

**قرآن کا چیلنج:** قرآن کے ابدی اور زندہ معجزہ ہونے پر اس سے واضح اور بین ثبوت کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے چیلنج کی آواز پندرہ صدیوں سے علم و ادب اور فکر و نظر کی وسیع فضاؤں میں گونج رہی ہے اور آج تک دنیا کا کوئی نابغہ، مفکر، ادیب اور دانشور اس چیلنج کے سامنے ایک لمحے کے لیے ٹھہرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ کسی ملت میں بھی تاب مقاومت نہیں ہوئی۔ قرآن مجید نے اس چیلنج کو بار بار اور مختلف صورتوں میں دھرایا ہے۔

کبھی ارشاد ہوا:

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝[5]

پس اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا کلام بنا لائیں۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۹ [2] ۳۴ سبا: ۲۸ [3] ۱۶ نحل: ۸۹ [4] ۶ انعام: ۳۸ [5] ۵۲ طور: ۳۴

کبھی دس سورتوں کا مطالبہ فرمایا:

قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ ...[1]

کہہ دیجیے: اگر تم سچے ہو تو اس جیسی خود ساختہ دس سورتیں بنا لاؤ۔

کبھی ایک مختصر سورت ہی کی دعوت دی:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ...[2]

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو (محمد نے) از خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ۔

ایک اور مقام پر اس چیلنج کو پھر دہرایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ...[3]

اور اگر تم لوگوں کو اس (کتاب) کے بارے میں شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسا کوئی سورہ بنا لاؤ۔

اتنے غیر مبہم الفاظ میں ایسی وضاحت کے ساتھ کسی چیلنج میں اس سے زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔

**چیلنج کا رخ:** نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے چیلنج کا رخ کسی ایک وقت، ایک صنف، ایک جماعت، ایک علاقے یا ایک زمانے کے افراد کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کی ہی طرح ایک ابدی اور لازوال چیلنج ہے، جس کی گونج قیام قیامت تک باقی رہے گی اور بنی نوع انسان کے تمام افراد اس میں شامل ہیں بلکہ قرآن میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اگر تم انفرادی طور پر اس قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بیشک اجتماعی کوشش کر دیکھو اور اللہ کو چھوڑ کر دنیا بھر کی مدد لے لو اور ہو سکے تو جنوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو۔

ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝[4]

کہہ دیجیے: اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل لا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

اس کے لیے کوئی تاریخ اور وقت مقرر نہیں بلکہ یہ ایک کھلا چیلنج ہے اور اس کی آواز ہر زمانے کی فضاؤں میں گونجتی اور دعوت مبارزت دیتی رہے گی۔

**قرآن کا علمی چیلنج:** درج بالا چیلنج کے علاوہ قرآن نے علمی اعتبار سے بھی چیلنج دیا کہ

---

[1] ۱۱ ھود: ۱۳ [2] ۱۰ یونس: ۳۸ [3] ۲ بقرہ: ۲۳ [4] ۱۷ اسراء: ۸۸

دیکھو اس میں ہر شے کا بیان موجود ہے:

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ...[1]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی بنا کر نازل کی ہے۔

پھر فرمایا:

وَ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○[2]

اور کوئی خشک وتر ایسا نہیں ہے جو کتاب مبین میں موجود نہ ہو۔

**قرآن کا رسالتی چیلنج:** قرآن نے حضور گرامی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کو بھی چیلنج کے طور پر پیش کیا کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی قوم میں زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا بلکہ مکہ کے معاشرے میں تو کوئی عالم بھی موجود نہ تھا اور تو اور حجاز کبھی علمی مرکز بھی نہیں رہا۔

اس کے باوجود آپ (ص) کا ایک ایسا جامع نظام حیات پیش کرنا جس کی نظیر لانے سے نہ صرف اس زمانے کے لوگ عاجز رہے بلکہ آج تک کوئی ایسا نظام پیش نہ کر سکا اور نہ ہی آپ (ص) کے لائے ہوئے نظام میں کوئی نقص ثابت کر سکا۔ یہ سب کچھ خود ایک کھلا چیلنج ہے اور اسے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○[3]

کہہ دیجیے: اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تمہیں پڑھ کر نہ سناتا اور نہ ہی اللہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا اس سے پہلے میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

چنانچہ چالیس سال آپ (ص) نے اس قوم میں زندگی بسر کی اور اس عرصے میں آپ (ص) نے نہ کوئی شعر کہا، نہ خطبہ دیا اور نہ کوئی اور غیر معمولی ہنر دکھایا اور پھر دفعتاً قرآن جیسی عظیم کتاب اور اسلام جیسا جامع نظام حیات پیش کر دیا۔ ایسی مثال، جو اس جہاں میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔

**قرآن کا تنظیمی چیلنج:** رسول کریم (ص) نے یہ قرآن تیئیس سال کی مدت میں پیش فرمایا۔ اس دوران آپ (ص) مختلف حالات سے گزرے۔ مکی دور میں ظلم و تشدد کا مقابلہ کیا اور فاقہ کشی اور تنگدستی سے بھی دوچار رہنا پڑا۔ ایک مدت تک شعب ابی طالب میں پوری دنیا سے منقطع ہو کر زندگی گزاری۔ مدنی زندگی میں قدرے بہتر حالات تھے مگر مختلف جنگوں سے دوچار تھے۔

ان بدلتے ہوئے حالات میں اگر محمد (ص) عربی صرف انسانی اور بشری حیثیت سے یہ قانون دے رہے ہوتے تو یقیناً اس طویل عرصے میں دیے جانے والے قانون کے اجزا اور مختلف شقوں میں اختلاف اور

---

[1] ۱۶ نحل: ۸۹ [2] ۶ انعام: ۵۹ [3] ۱۰ یونس: ۱۶

تضاد آ جاتا۔

اہل دانش و بینش غور کریں پورے قانون اسلام اور بیان قرآن میں کہیں بھی کوئی تضاد نہ ملے گا اور اس بارے میں بھی قرآن کا چیلنج ہے:

| | |
|---|---|
| اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝[1] | کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔ |

**بلاغت قرآن:** قرآن کی فصاحت و بلاغت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آج تک کوئی اس جیسی ایک سورت بھی نہ بنا سکا۔ جب کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور یہ زبان سلاست الفاظ اور جزالت معانی کے اعتبار سے دنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ پر مایہ زبان ہے۔

نیز فصاحت و بلاغت کے میدان میں عربوں میں نابغہ افراد کی بھی کوئی کمی نہ تھی اور اس کے ساتھ ساتھ فراغت بھی حاصل تھی۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ ایک چھوٹی سی سورت بنانے سے بھی عاجز تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام الٰہی میں ایک لفظ کی جگہ بدلنے سے بھی نہ صرف آیت کے معنی درہم برہم ہو جاتے ہیں بلکہ اس کی طرز اور روح کلام بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی بات کلام الٰہی کے معجزہ ہونے کا معیار ہے۔

غیر اللہ کے کلام میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ آنے سے ممکن ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت میں اضافہ ہو جائے اور اس کے طرز کلام اور روح کلام کا وزن بھی متاثر نہ ہو، مگر کلام الٰہی میں ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہاں تو فصاحت و بلاغت اپنے عروج پر ہے۔ اس لیے تبدیلی الفاظ سے اس کا معیار گر تو سکتا ہے مگر اونچا نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ ایک شخص نے سورۂ حمد کا مقابلہ کرنے کی ایک سعی لاحاصل کی اور اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے اللّٰہ نکال کر الرحمٰن رکھ دیا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلرَّحْمٰنِ ۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی جگہ کہا رَبِّ الْاَکْوان اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی بجائے مٰلِكِ الدَّیَّان کہا اور یوں عبارت تشکیل دی:

الحمد للرحمن ۔ رب الاکوان ۔ ملك الدیان ۔ لك العبادة و بك المستعان ۔ اهدنا صراط الایمان ۔

حالانکہ اللّٰہ اسم ذات ہے جو تمام اوصاف کا مجموعہ ہے، لہٰذا حمد کی نسبت اس ذات کی طرف ہوتی ہے جس میں تمام اوصاف موجود ہوں، نہ کہ کسی ایک صفت کی طرف۔ اسی طرح لفظ رب کی اضافت عالمین کی بجائے الاکوان کی طرف درست نہیں، کیونکہ الاکوان، کون کی جمع ہے اور کون وجود و حدوث

---

[1] ۴/ نساء: ۸۲

پر دلالت کرتا ہے۔ وجود و حدوث کی طرف لفظ خلق کی اضافت تو درست ہوسکتی ہے، یعنی خالق الاکوان کہنا تو کسی قدر درست ہوسکتا ہے مگر رب الاکوان کہنا کسی طور پر درست نہیں ۔ جب کہ عالمین کی طرف رب کی نسبت میں اتنے اسرار و رموز ہیں جو اس وقت ہمارے دائرہ بیان سے باہر ہیں۔[1]

**دعوت فکر:** اسلام کی حقانیت پر دیگر ہزاروں دلائل کے علاوہ یہ بات بھی ایک بین دلیل ہے کہ قرآن مجید انسان کو فکر و تدبر، تحقیق و تدقیق اور عقل سے کام لینے کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ اس عمل کو عبادت قرار دیتا ہے اور اسے ترک کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔

اگر اسلام حق وحقیقت پر مبنی نہ ہوتا تو لوگوں کو فکر و تحقیق سے دور رکھنے کی کوشش کرتا، نہیں تو کم از کم اس عمل کی ترغیب تو نہ دیتا۔ کیونکہ فکر و تعقل سے امر واقع کا انکشاف ہوتا ہے، حقائق سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ...[2]

کہہ دیجیے: تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ خلقت کی ابتدا کیسے ہوئی۔

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ دعوت مشاہدہ ہے۔ قرآن اور سائنس دونوں مشاہدے کو معارفِ انسانی کی اساس قرار دیتے ہیں۔

فَانْظُرُوْا : عقل سے کام لو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشاہدات ومحسوسات کی بنیاد پر عقل کو یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ۔ اللہ نے پہلی بار مخلوق کو کیسے پیدا کیا۔

اس آیت سے ایک حیرت انگیز یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قرآن اس طرز استدلال کو صحیح قرار دیتا ہے جس میں محسوسات اور مشاہدات پر مبنی عقلی استدلال اور نتیجہ گیری ہو۔ صرف مشاہدہ یا صرف عقلی استدلال سے کسی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ ...[3]

کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے ہو جاتے؟

اس آیت میں دلوں کے تعقل کو سِيْرُوْا فِي الْاَرْض کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جو کہ نہایت قابل توجہ امر ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے : البیان فی تفسیر القرآن از امام الخوئی ص ۹۵ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲۰ [3] ۲۲ حج: ۴۶

# آفاق میں تفکر و تعقل

## الف۔ نباتات:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ [1]

پس انسان کو اپنے طعام کی طرف نظر کرنی چاہیے کہ ہم نے خوب پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو خوب شگافتہ کیا پھر ہم نے اس میں دانے اگائے نیز انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور میوے اور چارے بھی جو تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست ہیں۔

اور

اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ [2]

ذرا اس کے پھل کو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو۔ اہل ایمان کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں نباتات اور میوہ جات کے بارے میں غور وفکر کے لیے درج ذیل مراحل بیان فرمائے گئے ہیں اور ان کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے:

۱۔ آبیاری: اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا

۲۔ زمین کی شگافتگی: ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا

۳۔ پودے کی پرورش: فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا

۴۔ پھل کا آنا: اِذَاۤ اَثْمَرَ

۵۔ پھل کی تیاری: وَ يَنْعِهٖ

## ب۔ آسمانوں کے بارے میں غور و تعقّل:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ... [3]

کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان میں غور نہیں کیا۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [4]

کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں نظر ڈالو کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں۔

---

[1] ۸۰ عبس: ۲۴ تا ۳۲ [2] ۶ انعام: ۹۹ [3] ۷ اعراف: ۱۸۵ [4] ۱۰ یونس: ۱۰۱

وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ[1]

اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا۔

## طریقہ غور وفکر:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ۝[2]

تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے نظمی نہیں دیکھے گا، ذرا پھر پلٹ کر دیکھو کیا تم کوئی خلل پاتے ہو؟ پھر پلٹ کر دوبارہ دیکھو تمہاری نگاہ عاجزانہ طور پر تھک کر لوٹ آئے گی۔

اس آیت میں خداوند عالم نے تحقیق اور غور وفکر کا ایک اہم اصول بیان فرمایا ہے کہ کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے اور اس کے بارے میں نفی یا اثبات کا کوئی نظریہ قائم کرنے کے لیے بار بار اس کو زیر مطالعہ لانا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ تجربے میں ایک مرتبہ کامیاب ہو جانا بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس کی تطبیق میں کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی ہو گی ۔ یونہی عقلی دلائل میں بھی غلطی اور لغزش فکری کا امکان برقرار رہتا ہے۔ قرآن نے اپنی دعوت میں انسانوں کو یہ طریقہ بھی بتلایا ہے کہ بار بار غور وفکر کر کے دیکھو تا کہ یقین کے مرحلے تک پہنچو۔

اس کے علاوہ متعدد آیات میں خداوند عالم اپنی دعوت فکر کو درج ذیل الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

نظر۔ تدبر۔ تعلم۔ تفقّہ۔ تعقل۔ تیقّن۔

مثال کے طور پر چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

تدبر: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝[3]

کیا لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

تعلّم: قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ[4]

اہل علم کے لیے ہم نے اپنی آیات کھول کر بیان کی ہیں

تفقّہ: قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ[5]

ہم نے صاحبان فہم کے لیے آیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔

تعقّل: كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ[6]

عقل رکھنے والوں کے لیے ہم اس طرح نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

---

۱۔ ۳ آل عمران: ۱۹۱ ۲۔ ۶۷ ملک: ۳۔۴ ۳۔ ۴۷ محمد: ۲۴
۴۔ ۶ انعام: ۹۷ ۵۔ ۶ انعام: ۹۸ ۶۔ ۳۰ روم: ۲۸

تیقّن: قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ [1] — ہم نے تو اہل یقین کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کی ہیں۔

قرآن تعقل کو سعادت اور نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ [2] — اور وہ کہیں گے: اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمیوں میں نہ ہوتے۔

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد آیات درج ذیل حوالوں سے دعوتِ فکر دیتی ہیں:

عقل:
- اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ [3] — کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔
- اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ [4] — اگر تم لوگ عقل رکھتے ہو۔
- لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [5] — شاید تم عقل سے کام لو۔
- لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [6] — غور وفکر سے کام لینے والوں کے لیے۔
- لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ [7] — شاید وہ فکر کریں۔

**اولوا الالباب** (صاحبانِ عقل): اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ [8] نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

**اولی النُّھٰی** (صاحبانِ عقل): اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى [9] صاحبانِ عقل کے لیے اس میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔

**قرآن کا طرزِ استدلال:** قرآن کا موقف یہ ہے کہ ہر نظریے کے لیے دلیل، ہر فکر کے لیے برہان اور ہر عقیدے پر علمی ثبوت فراہم ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن غیر اسلامی عقائد و نظریات رکھنے والوں سے ایسا ہی مطالبہ کرتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ [10] — کہہ دیجیے: کیا تم نے انہیں (کبھی) دیکھا بھی ہے جنہیں اللہ کے سوا تم پکارتے ہو؟ مجھے بھی دکھاؤ انہوں نے زمین کی کون سی چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں میں ان کی شرکت ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی باقیماندہ علمی (ثبوت) میرے سامنے پیش کرو۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۱۸ [2] ۶۷ ملک: ۱۰ [3] ۳۶ یٰسین ۶۸
[4] ۲۶ شعراء: ۲۸ [5] ۲۴ نور: ۶۱ [6] ۱۰ یونس: ۲۴
[7] ۷ اعراف: ۱۷۶ [8] ۱۳ رعد: ۱۹ [9] ۲۰ طٰہٰ: ۵۴ و ۱۲۸ [10] ۴۶ احقاف: ۴

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○[1]

کہہ دیجیے: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے لاسکو؟ تم تو صرف گمان کے پیچھے چلتے ہو اور یہ کہ تم فقط قیاس آرائیاں کرتے ہو۔

قرآن اندھی تقلید کی مذمت کرتا ہے اور مطلب کو قبول یا رد کرنے کے لیے علم کو معیار قرار دیتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ[2]

اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے۔

قرآن توحید کا یہ خاصہ بیان کرتا ہے کہ یہ نظریہ دلیل و برہان پر قائم ہے اور دوسرے نظریات رکھنے والوں کو چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ سچا ہے تو اس پر دلیل و برہان قائم کرو۔

وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ...[3]

اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○[4]

کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہہ دیجیے: اپنی دلیل پیش کرو اگر تم لوگ سچے ہو۔

قرآن جہاں علم و یقین کو دلیل کی اساس قرار دیتا ہے وہاں غیر علمی اور غیر یقینی چیزوں کو دلیل سمجھنے کو جاہلیت کا وطیرہ قرار دیتا ہے:

يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ[5]
وَ مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ[6]

وہ ناحق اللہ پر زمانہ جاہلیت والی بدگمانیاں کر رہے تھے. ان میں سے اکثر محض ظن کی پیروی کرتے ہیں جب کہ ظن انسان کو حق (کی ضرورت) سے ذرہ برابر بے نیاز نہیں کرتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ[7]

اے ایمان والو! بہت سے بدگمانیوں سے بچو۔ بعض بدگمانیاں یقیناً گناہ ہیں۔

اپنے اسی موقف کی بنیاد پر قرآن سطحی فکر کی مذمت کرتا ہے:

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○[8]

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کچھ سننے یا سمجھنے کے لیے تیار ہیں؟ (نہیں) یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۴۸ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۶ [3] ۲۳ مومنون: ۱۱۷ [4] ۲۷ نمل: ۶۴
[5] ۳ آل عمران: ۱۵۴ [6] ۱۰ یونس: ۳۶ [7] ۴۹ حجرات: ۱۲ [8] ۲۵ فرقان: ۴۴

رسول اکرم (ص) سے روایت ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا:

فکرة ساعة خیرٌ من عبادة سنة۔[1]

کچھ دیر کے لیے غور وفکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

لا عبادة کالتفکر فی صنعة اللّٰہ عزوجل۔[2]

اللہ کی مخلوقات پر غور وفکر سے بہتر کوئی عبادت نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اللّٰہ تبارك و تعالیٰ خصّ عباده، بآیتین من کتابه: ان لا یقولوا حتی یعلموا، و لایردوا ما لم یعلموا۔ قال اللّٰہ عز و جل: اَلَمۡ یُؤۡخَذۡ عَلَیۡهِمۡ مِّیۡثَاقُ الۡکِتٰبِ اَنۡ لَّا یَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ ....[3] و قال تعالیٰ: بَلۡ کَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَ لَمَّا یَاۡتِهِمۡ تَاۡوِیۡلُهٗ ؕ ۔[4]

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے بندوں کے ساتھ دو آیتیں مخصوص فرمائی ہیں: علم سے پہلے کسی بات کے قائل نہ ہوں اور نہ علم سے پہلے کسی بات کو رد کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: کیا ان سے کتاب کا میثاق نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا کچھ بھی نہ کہیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے احاطہ علم میں نہیں ہے اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں کھلا۔

## عقل اور جذبات و احساس کا امتزاج

ذہنی وقلبی لحاظ سے انسان میں دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک فکری اور دوسرا جذباتی یا احساساتی۔ فکر کا تعلق عقل سے اور احساسات کا تعلق ضمیر اور وجدان سے ہوتا ہے۔ فکر کی منزل حق وحقیقت ہے کہ حق کے متلاشی فکر وعقل سے کام لیتے ہیں، جب کہ احساسات کا ہدف جذبات کو ابھارنا، ذہنی فرحت اور روحانی غذا بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ فلسفی اور مفکر عقل کی باتیں کرتے ہیں اور حقائق کو کھول کر سامنے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ اس بات کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے کہ ان کا کلام کس قدر خشک، پھیکا، پیچیدہ اور تھکا دینے والا ہے۔ جب کہ شعراء سننے والوں کے جذبات اور احساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کی شیرینی سے سامعین کے ذوق سماعت کو محظوظ کرتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے استعاروں اور تشبیہات سے ان کے ضمیر اور وجدان کو سیراب کرتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ باتیں حقیت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ وہ دوسروں کو رلاتے ہیں خود نہیں روتے، دوسروں کو وجد میں لاتے ہیں خود وجد میں نہیں آتے۔

---

[1] بحار الانوار ۶۱: ۳۲۵
[2] الامالی للطوسی ص ۱۴۶
[3] ۷ اعراف: ۱۶۹
[4] ۱۰ یونس: ۳۹. اصول الکافی ۱: ۴۳

ہر بات کرنے والا ان دونوں میں سے ایک طرز تکلم کو اختیار کرتا ہے بلکہ ایک شخص ایک وقت میں ان دونوں میں سے ایک ہی طرز کو اختیار کر سکتا ہے۔

بوعلی سینا کو دیکھیے جب وہ فکر کی باتیں کرتے ہیں تو بہترین فلسفی ہیں اور بہت سے حقائق کو کھول کر سامنے رکھتے ہیں ۔ جب وہ احساساتی طرز اختیار کرتے ہیں تو تخیلات اور جذبات کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک کلام میں بیک وقت حقیقت نمائی اور احساسات کی سیرابی دونوں نہیں پائی جاتیں۔ یہ صرف کلام الٰہی کا معجزہ ہے جس میں یہ دونوں باتیں بیک وقت ملتی ہیں۔ عقل کی آبیاری اور ذوق سماعت کی تسکین ، ایک ہی جملے میں برہان اور عقلی دلیل کے ساتھ کلام میں شیرینی اور بیان میں لطافت بھی موجود ہے۔ ایک ہی عبارت میں عقل وخرد کو بھی جھنجھوڑا ہے اور اس کے ساتھ ہی احساسات و جذبات کو بھی ابھارا ہے ۔ یہ کلام خدا کا معجزہ ہے کہ اس نے ایک ہی لمحے میں عقل اور دل دونوں سے گفتگو کی ہے اور حقائق کے ساتھ ذوق جمالیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً قرآن جب اسلاف کے واقعات بیان کرتا ہے تو عقل کا حق بھی ادا ہوتا ہے او رقلب کو بھی اپنا حصہ مل جاتا ہے۔

# قرآن کے تازہ ترین معجزات

زمین ۔حرکت زمین ۔زمین خلا میں ۔زمین، قدرت کا ریکارڈر۔
استخوان ۔عناصر کی مقدار۔اضافت ۔نظام زوجیت۔ عالم غیر مرئی۔
تسبیح ایک آفاقی فریضہ۔صدر المتألہین شیرازی کا نظریہ۔سائنسی نظریہ۔
فضائے آسمان ۔مواقع نجوم ۔آسمانوں کی زندہ مخلوقات ۔کائنات کی
وسعت۔مخمور آنکھیں ۔مادہ اولین ۔نطفۂ امشاج ۔
عفت و پاکدامنی ۔مضغہ غیر مخلقہ ۔مضغہ مخلقہ ۔

## زمین

وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۙ﴿۲۰﴾ اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

ماہرین ارضیات (جیالوجسٹ) اپنی سالہاسال کی تحقیقات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین ابتدا میں ایک آتشیں کرہ تھی۔

- اس کے بعد تدریجاً سرد ہونا شروع ہوئی۔
- پھر بارش کا دور شروع ہوا۔
- پھر اس کے بعد سبزہ اگنا شروع ہوا۔

چنانچہ قرآن مجید زمین کے ارتقائی مراحل کو اس طرح بیان کرتا ہے:

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۖ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ﴿۲۸﴾ وَ اَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰىهَا ۖ﴿۲۹﴾ وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ﴿۳۰﴾ اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ مَرۡعٰىهَا ۖ﴿۳۱﴾

کیا تمہارا خلق کرنا زیادہ مشکل ہے یا اس آسمان کا جسے اس نے بنایا ہے؟ اللہ نے اس کی چھت اونچی کی پھر اسے معتدل بنایا اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو روشن کیا اور اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا، اس نے زمین سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

اس آیہ مبارکہ سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے:

پہلا مرحلہ: رات اور دن کا سلسلہ

دوسرا مرحلہ: دحو الارض (زمین کو حرکت دینا)

تیسرا مرحلہ: سبزہ اگایا جانا

زمین کے ارتقائی مراحل کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا:

قُلۡ اَئِنَّكُمۡ لَتَكۡفُرُوۡنَ بِالَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ وَ تَجۡعَلُوۡنَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ

کہہ دیجیے: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو اور اس کے لیے مدمقابل قرار دیتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا؟ وہی تو عالمین کا پروردگار ہے اور اسی

---

۱ ۵۱ ذاریات: ۲۰ ۲ ۷۹ نازعات: ۲۷ تا ۳۱

الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝ [1]

نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکات رکھ دیں اور اس میں چاردنوں میں حاجتمندوں کی ضرورت کے برابر سامان خوراک مقرر کیا۔

اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے درج ذیل چیزوں کو ترتیب وار خلق فرمایا:

۱۔ پہلے زمین کو خلق فرمایا

۲۔ اس کے بعد اس میں پہاڑ گاڑ دیے۔

۳۔ اس کے بعد زمین کو قابل سکونت بنایا: بٰرَكَ فِيْهَا ۔

۴۔ زمین پر بسنے والوں کے لیے روزی (قوت) مقرر کی۔

**حرکت زمین :** اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق کے بارے میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ [2]

اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا۔

مفسرین نے دحو کا ترجمہ وتفسیر ''بچھانا'' کیا ہے کیونکہ قدماء کے لیے حرکت ارض ایک ناقابل تصور وتوجیہ امر تھا۔

تاج العروس میں دحو کے یہ معنی لکھے ہیں:

دحا السیل بالبطحاء: دحی و المطر الداحی الذی یدحو الحصی عن وجه الارض بنزعه دحی الرمی بقهر۔

یعنی سیلاب نے کنکروں کو دور پھینک دیا۔ اس بارش کو المطر الداحی کہتے ہیں جو کنکروں کو زمین سے اکھاڑ پھینکتی ہے طاقت کے ساتھ دور پھینکنے کو الدحی کہتے ہیں۔

المنجد میں تحریر ہے:

دحی الحجر بیده، رمی بیده۔

دحی الحجر بیده کا معنی ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ سے پتھر پھینکا۔

یوں لغت کی رو سے مندرجہ بالا آیت کے معنی یہ ہو سکتے ہیں: اس کے بعد اس نے زمین کو حرکت دے دی۔

البتہ الدَّحْوُ بچھانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ آیت حرکت زمین پر صراحتاً دلالت کرتی ہے۔

دوسری جگہ زمین کی حرکت کے بارے میں ایک اور لطیف اشارہ ملتا ہے:

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ... [3]

جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا۔

---

[1] ۴۱ حم سجدہ ۹۔۱۰ [2] ۷۹ نازعات: ۳۰ [3] ۲۰ طٰہٰ: ۵۳

گویا زمین کو گہوارے سے تشبیہ دے کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ زمین انسانوں کے لیے گہوارہ اس لیے ہے کہ اس کی حرکت میں سکون اور گردش میں لذت اور جنبش میں تنوع ہے۔

زمین کی حرکت کو مزید وضاحت کے ساتھ قرآن و سنت میں اس لیے بیان نہیں کیا گیا کہ قرآن ایک ایسے زمانے میں نازل ہو رہا تھا جس میں حرکت زمین کسی اعتبار سے بھی نا قابل فہم بات تھی۔ اگر لوگوں کی فکری سطح سے ہٹ کر کوئی مفہوم بیان کیا جائے تو اصل مقصد کو چھوڑ کر اس بات کو سمجھانے اور اس کا دفاع کرنے اور اس کی توجیہ کرنے میں ہی وقت اور قوت صرف ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم(ص) کا ارشاد ہے:

أُمِرْنَا أن نُّكَلِّمَ الناس على قدر عقولهم۔[1]

ہمیں حکم ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات کریں۔

ممکن ہے زمین کو اس کی حرکت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس پر بسنے والوں کے لیے آرام دہ اور سکون بخش ہونے کی وجہ سے گہوارہ کہا گیا ہو۔

**زمین خلا میں:** قرآن مجید جس زمانے میں نازل ہوا، اس وقت زمین کے بارے میں لوگوں کا نظریہ اس حد تک خرافاتی تھا کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ زمین کو ایک گائے اپنے سینگ پر اٹھائے ہوئے ہے یا زمین پشتِ نہنگ پر واقع ہے۔ ایسے ماحول میں عام فکر سے ہٹ کر قرآن نے یہ واضح کیا:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝[2]

اللہ آسمانوں اور زمین کو یقیناً تھامے رکھتا ہے کہ یہ اپنی جگہ چھوڑ نہ جائیں اگر یہ اپنی جگہ چھوڑ جائیں تو اللہ کے بعد انہیں کوئی تھامنے والا نہیں ہے، یقیناً اللہ بڑا بردبار، بخشنے والا ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں یُمْسِك کا لفظ آیا ہے جس کے معنی تھامنے کے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت امام علی علیہ السلام سے روایت ہے:

انشأ الارض فامسكها من غير اشتغال و ارساها على غير قرار واقامها بغير قوائم...و حصنها من الاود والاعوجاج و منعها من التهافة والانفراج۔[3]

وہ (اللہ) زمین کو وجود میں لایا اور بغیر اس کام میں الجھے ہوئے اسے برابر تھامے رکھا اور بغیر کسی چیز پر ٹکائے ہوئے اس نے اسے برقرار کیا اور بغیر ستونوں کے اسے قائم کیا، کجی اور جھکاؤ سے اسے محفوظ رکھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے اور بکھرنے سے اسے بچائے رکھا۔

---

[1] اصول الکافی ۸: ۲۶۸ [2] ۳۵ فاطر: ۴۱ [3] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۸۴ ص ۴۹۷

قرآن ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ کِفَاتًا ۙ﴿۲۵﴾ اَحۡیَآءً وَّ اَمۡوَاتًا ﴿ۙ۲۶﴾[1]　　کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کے لیے کِفَات نہیں بنایا۔

تاج العروس میں مرقوم ہے:

کفت الطائر وغیرہ ، یکفت کفتاً و کفاتاً ککتاب و کفیتاً کامیر۔

اسرع فی الطیران۔

کفات سرعت سے پرواز کرنے کو کہتے ہیں۔

صحاح اللغۃ میں لکھا ہے:

عدو کفیت و کفات ای سریع۔　　تیزی سے دوڑنے کو کفیت یا کفات کہتے ہیں۔

زمین کی پرواز قدماء کے لیے قابل فہم نہ ہونے کی وجہ سے کِفَات کے معنی انہوں نے ''جمع'' کے لیے اور آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے: کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والی نہیں بنایا۔

کفاتاً مصدر ہے یا مفعول مطلق ہے، فعل محذوف ہے یعنی تکفت کفاتا اور کفاتًا بمعنی اسم فاعل بھی آ سکتا ہے۔ اس صورت میں احیاءً و امواتًا حال بنے گا یا مفعول بہ یعنی زندوں اور مردوں کو لے کر پرواز کرنے والی زمین۔

اس تفسیر پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ جب کِفَات بمعنی پرواز اس وقت کے لوگوں کے لیے قابل فہم نہیں تھا تو اللہ ایسی بات کیسے کرسکتا ہے جو مخاطبین کے لیے قابل فہم نہ ہو۔

اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ القرآن یفسرہ الزمان۔ ہر زمانے میں قرآن کے جدید معانی و مطالب سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ زمان نزول کے لوگوں کے لیے بے معنی ہیں، وہ بھی اپنے زمانے کے مطابق مطالب اخذ کر سکتے ہیں۔

**زمین۔ قدرت کا ریکارڈر:** قیامت کے دن زمین کی طرف سے انسانی اعمال کی گواہی اور انسان کا ان اعمال کا مشاہدہ کرنے کے بارے میں قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَہَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَہَا ؕ﴿۵﴾[2]　　اس دن وہ (زمین) اپنے حالات بیان کرے گی کیونکہ اس کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

قدماء کے لیے خود عمل دکھائے جانے کا تصور نا قابل فہم تھا اس لیے انہوں نے ''تجسم اعمال'' کے ساتھ اس کی تاویل کی اور کہا:

---

[1] ۷۷ مرسلات: ۲۵۔ ۲۶　　[2] ۹۹ زلزلۃ: ۴۔ ۵

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝[1]

پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

سے مراد ہے کہ عمل کی جزا اور سزا دیکھے گا۔ خود عمل تو دنیا میں ہو چکا، وہ دوبارہ دیکھنے کے قابل نہیں۔ حالانکہ قرآن میں اس آیت سے پہلے صراحتاً کہا گیا ہے:

... لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ[2]

تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

اس صراحت کی بھی وہ تاویل کرتے تھے کہ اعمال مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔

لیکن آج تاویل کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اعمال بصورت انرجی باقی رہتے ہیں اور فضائے زمین سے ناپید نہیں ہوتے، بلکہ فضائے زمین انسانی حرکات و سکنات کو اور اقوال و افعال کو اپنے اندر ضبط اور محفوظ کر لیتی ہے نیز ارشاد الٰہی ہے:

وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝[3]

اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

مفسرین نے یہاں بھی تاویل کی کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال مجسم ہو کر سامنے موجود ہوں گے۔ یہ تاویلات اس لیے تھیں کہ علمائے قدیم کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ یہ زمین ایک کتاب کی طرح ہے جس میں خود عمل ثبت ہوتا رہتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝[4]

(انسان) کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے۔

چنانچہ جب انسان اس آفاقی کتاب کا بروز قیامت مشاہدہ کرے گا تو کہے گا:

يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ[5]

ہائے ندامت! یہ کیسا نامہ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے۔

انسان اپنے خود عمل کو قیامت کے دن کیسے دیکھ سکے گا؟ یہ بات قرآن مجید میں بڑے واضح پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝[6]

بے شک تو اس چیز سے غافل تھا، چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے، لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

---

[1] حوالہ سابق: ۷۔۸ [2] حوالہ سابق: ۶ [3] ۱۸ کہف: ۴۹
[4] ۵۰ ق: ۱۸ [5] ۱۸ کہف: ۴۹ [6] ۵۰ ق: ۲۲

تجسم اعمال کی دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سائنسی اعتبار سے جیسا کہ مادہ انرجی میں بدل جاتا ہے اور انرجی مادے میں بدل جایا کرتی ہے، لہٰذا انسانی اعمال اگرچہ آج انرجی ہیں، کل بروز قیامت یہ اعمال مادے کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ چنانچہ بعض روایات سے بھی اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ انسانی تسبیح وتمجید جنت میں خشت وخاک کی صورت اختیار کرلے گی۔ جس سے قصور ومحلات تعمیر ہوں گے۔

**استخوان:** جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ہڈیاں اعصاب پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں اور تولید نسل میں بھی ہڈیوں کا بڑا دخل ہے۔ ہڈیوں میں غذائی مواد کا ایک ذخیرہ موجود ہوتا ہے جس سے جسم ہنگامی ضرورت پوری کرتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ خون میں موجود سرخ جثیموں سے انسانی جسم میں خون اپنا فعال کردار ادا کرتا ہے، جس کی وجہ سے ہر منٹ میں ۱۸۰ ملیین جثیمے استعمال ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ تازہ دم جثیمے پیدا کرنے کی ذمہ داری ہڈیوں پر عائد ہوتی ہے۔

ہڈیوں سے بہت سے قدیم مسائل کے حل میں مدد لی جاتی ہے۔ سائنسدان مردوں کی ہڈیوں سے ان کی عمریں، مرض، جنس، قد، نژاد، جرم غرض ان کی زندگی اور ماحول وغیرہ کی پوری تاریخ کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔

خالق اکبر ہڈیوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

| | |
|---|---|
| اَ یَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ[1] | کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ |
| وَ انۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُهَا ثُمَّ نَکۡسُوۡهَا لَحۡمًا ؕ[2] | پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں۔ |

**عناصر کی مقدار:** کائنات میں موجود عناصر ایک خاص مقدار میں تشکیل پاتے ہیں۔ عناصر کی اپنی ذاتی تشکیل یا دوسرے عناصر کے ساتھ اتحاد دونوں باتیں ایک معینہ مقدار اور ایک آفاقی محکم قانون کے تحت انجام پاتی ہیں۔

عناصر کی تشکیل میں ایک جامع آفاقی نظام کے انکشاف کے بعد سائنسدانوں نے دیکھا کہ مختلف عناصر کے درمیان کچھ کڑیاں غائب ہیں جو موجود ہونی چاہئیں۔ ان کی تلاش ضروری ہے۔ چنانچہ بعد میں عین اسی تسلسل کے مطابق مزید عناصر کا انکشاف ہوا اور تشکیل عناصر کے آفاقی نظام کے تحت کڑیاں مل گئیں۔

چنانچہ شمسی نظام کے تحت مشتری اور مریخ کے درمیان کڑیاں نہیں ملتی تھیں اور سائنسدانوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ان دونوں سیاروں کے درمیان ایک اور سیارہ ہونا چاہیے اور اسے تلاش کرنا چاہیے۔ چنانچہ

---

[1] ۷۵ قیامت: ۳ [2] ۲ بقرہ: ۲۵۹

بعد میں اس سیارے کا انکشاف ہوا اور یہ کڑی بھی مل گئی۔

قرآن مجید نے اس آفاقی نظام اور کائنات کے حسابی قوانین کی طرف کس جامع اور لطیف انداز میں دولفظوں میں ارشارہ فرمایا ہے:

وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ○[1] اور اس کے ہاں ہر چیز کی ایک مقدار ہے۔

**اضافت:** نیوٹن کی طرف سے کشش ثقل کے انکشاف کے بعد یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ فوق اور تحت مطلق وجود نہیں رکھتے بلکہ یہ دونوں اضافی مفہوم ہیں کہ ایک جگہ کچھ لوگوں کے لیے تحت ہے اور عیناً وہی جگہ کچھ دوسرے لوگوں کے لیے فوق ہے۔

لیکن ایک اور سائنسدان آئن سٹائن نے نظریہ اضافت قائم کر کے یہ بھی ثابت کردیا کہ دنیا میں ہر شے اضافی ہے۔ یہ کائنات یک گونہ نہیں ہے۔ منجملہ زمان بھی مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی چیز نور کی رفتار سے زیادہ سرعت سے سفر کرے تو اس کا وقت اور سفر نہ کرنے والی دوسری اشیاء کا وقت مختلف ہوگا۔

بعض سائنسدانوں کی تحقیقات کے مطابق اگر کوئی شخص خلائی جہاز میں نور کی رفتار سے سفر کرے تو جب اس مسافر کو سفر کرتے ہوئے صرف ۲۹ سال گزریں گے تو زمین والوں کے لیے تین ملین یعنی ۳۰ لاکھ سال گزر چکے ہوں گے۔[2]

اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت ہماری توجہ مرکوز کرتی ہے:

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○[3]

وہ آسمان سے زمین تک امور کی تدبیر کرتا ہے، پھر یہ امر ایک ایسے دن میں اللہ کی بارگاہ میں اوپر کی طرف جاتا ہے جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس آیت کی تفسیر نظریۂ اضافت سے کر رہے ہیں، بلکہ ایک امکانی صورت اور توجہ کے لیے ہے۔ نظریہ اضافت ایک تھیوری سے زیادہ نہیں ہے۔

**نظام زوجیت:** نزول قرآن سے پہلے عام خیال یہ تھا کہ زوجیت کا نظام حیوانات اور نباتات میں بھی قائم ہے۔ لیکن قرآن کریم کے انکشاف کے مطابق زوجیت ایک کائناتی نظام ہے اور ہر شے زوجیت پر قائم ہے۔ حتیٰ کہ کائنات کی سب سے چھوٹی مخلوق (ایٹم) بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] ۱۳ رعد: ۸

[2] Martin Gardener Relativity For Million ترجمہ فارسی از محمود مصاحب۔ طبع تہران

[3] ۳۲ سجدہ: ۵

وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ○[1] — اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

ایک اور آیت میں اللہ نے نظام زوجیت کو تین مختلف عوالم میں تقسیم فرمایا ہے:

۱۔ عالم نباتات

۲۔ عالم انفس

۳۔ عالم مجہولات

ارشاد الٰہی ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○[2] — پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے بنائے ان چیزوں سے جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنہیں یہ جانتے ہی نہیں۔

نظام زوجیت ان چیزوں میں بھی موجود ہے جنہیں انسان جانتے تک نہیں۔ حتیٰ کہ کل کائنات کا جوڑا اینٹی (Anti) کائنات تلاش کیا جا رہا ہے۔

**عالم غیر مرئی:** یوں تو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کی تفسیر میں بہت سے عالمین کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن شاید ان سب میں سب سے اہم تقسیم یہ ہو: عالم مرئی اور عالم غیر مرئی (ان دیکھا جہاں)۔

عالم مرئی میں ہر وہ چیز آ جاتی ہے جو طبعی یا مشینی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہو۔ عالم غیر مرئی تو شاید زیادہ پر اژدھام، بارونق اور زیادہ شور و شغب کا حامل ہوگا۔ ریڈیائی لہروں، کشش کی لہروں، رنگوں اور جراثیم کے علاوہ لاکھوں غیر مرئی موجودات اس کائنات میں موجود ہیں جن کا عشر عشیر بھی انسان کے حیطۂ انکشاف میں نہیں آیا۔ قرآن اس ان دیکھی دنیا کی طرف ایک خفیف اشارہ فرماتا ہے:

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾[3] — پس مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے ہو۔

**تسبیح ایک آفاقی فریضہ:** ارشاد الٰہی ہے:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ[4] — اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

مفسرین نے یہاں پر ہر شے کی تسبیح سے مراد یہ لیا ہے کہ ان چیزوں کا وجود ذات باری تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتا ہے یا ان کے وجود میں جو حکمت الٰہیہ مضمر ہے، یعنی ہر چیز بزبان حال بتاتی ہے کہ ان

---

۱؎ ۵۱ ذاریات: ۴۹ ۲؎ ۳۶ یسین: ۳۶ ۳؎ ۶۹ حاقہ: ۳۸۔۳۹ ۴؎ ۱۷ اسراء: ۴۴

حکمت آمیز اشیاء کا خالق ہر نقص وشرک سے پاک ہے۔

مگر یہ تفسیر درج ذیل وجوہ کی بنا پر قابل قبول نہیں ہے:

۱۔ اس آیت میں فرمایا گیا: لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ''تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو''۔ لیکن اگر تسبیح سے مراد یہی تکوینی تسبیح ہے تو اسے تو ہم سمجھ بھی رہے ہیں اور بیان بھی کر رہے ہیں۔

۲۔ دوسری جگہ پر ارشاد ہوا ہے کہ یہ اشیاء اپنی دعا و تسبیح کا علم بھی رکھتی ہیں۔ اگر یہ تکوینی تسبیح ہے تو خود اشیاء کو اس کا علم نہیں ہوسکتا۔

ملاحظہ ہو آیت مجیدہ:

| | |
|---|---|
| اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ [1] | کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی؟ ان میں سے ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے۔ |

۳۔ قرآن کریم نے ان میں سے بعض کی تسبیح کے لیے وقت بھی بتایا ہے کہ پہاڑ صبح و شام تسبیح پڑھتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

| | |
|---|---|
| اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ○ [2] | ہم نے ان کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا تھا، یہ صبح و شام ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ |

اگر تسبیح سے مراد تکوینی تسبیح ہے تو اس کا کوئی وقت نہیں ہوتا بلکہ یہ تو غیر ارادی طور پر خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ لیکن آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی تسبیح کا وقت بھی مقرر ہے اور معین وقت کی تسبیح کبھی بھی بلاشعور نہیں ہوسکتی ہے۔

**صدر المتألہین شیرازی کا نظریہ:** اس عظیم فلسفی کا نظریہ اس ضمن میں یہ ہے کہ انسان سے لے کر نباتات و جمادات، ہر شے میں کسی حد تک شعور و ادراک موجود ہے، مگر ایک جیسا نہیں، بلکہ کچھ تفاوت کے ساتھ اور اس کا کلیہ یہ پیش کرتے ہیں کہ موجودات میں جہاں مادیت کا پہلو قوی ہوگا وہاں حیات وشعور کا پہلو کمزور ہوگا اور جہاں مادیت کا پہلو کمزور ہوگا، وہاں حیات وشعور کا پہلو قوی ہوگا۔ اپنے اس نظریے کے لیے وہ مذکورہ بالا آیات سے ہی استدلال کرتے ہیں۔

**سائنسی نظریہ:** جدید سائنسی تحقیقات بھی اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ پودوں میں بھی شعور و ادراک موجود ہے۔ چنانچہ یہ امر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پودوں میں ڈر، خوشی، سرمستی اور دیگر قسم کے شعور موجود

---

[1] ۲۴ نور: ۴۱ [2] ۳۸ ص: ۱۸

ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں اس سلسلے میں مزید انکشافات ہوں گے۔ یوں قرآن ہر دور میں اپنا تازہ ترین معجزہ پیش کرتا رہے گا۔

**فضائے آسمان:** قرآن مجید نے فضائے آسمان کی کیفیت اس زمانے میں بتائی جب لوگوں کو ابھی یہ بھی علم نہ تھا کہ اگر انسان اس میں بلند ہو جائے تو کیسے حالات سے دوچار ہوگا۔

لیکن اس صدی کے انسان کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ انسان زمین سے جتنا بلند ہوتا جاتا ہے، ہوا اتنی ہی رقیق سے رقیق تر ہوتی جاتی ہے۔ زیادہ بلندی پر پہنچ جانے کی صورت میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے انسان کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سے مزید بلند ہونے پر انسان تنگی تنفس سے ہلاک ہوسکتا ہے۔

یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد درج ذیل آیت میں قرآن کا پیش کردہ مفہوم واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ [1]

پس جسے اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو۔

**مواقع نجوم:** ہم زمین کی محدود مسافتوں کو ناپنے کے لیے میل، فرسخ یا کلومیٹر وغیرہ کو پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن لامتناہی کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار ستاروں اور کہکشاؤں کے فاصلوں کو ناپنے کے لیے ہمارے یہ محدود پیمانے نہایت ناکافی ہیں۔ لہٰذا اس چیز کو پیمانہ قرار دیا گیا جو اب تک کی انسانی معلومات کے مطابق کائنات میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہے اور وہ ہے نور کی رفتار۔ نور ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر مسافت طے کرتا ہے اور سال میں ساٹھ کھرب ($6x10^{12}$) میل کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس لیے ساٹھ کھرب میل کو ایک نوری سال کہتے ہیں۔

سورج کا نور ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم سے نزدیک ترین ستارے کا نور ہم تک چار نوری سالوں میں پہنچتا ہے۔ کچھ ستارے ہم سے تین سو نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں اور کچھ اس سے بھی زیادہ فاصلے پر ہیں۔ اس کے بعد کہکشاؤں کی باری آتی ہے کہ کچھ کہکشائیں ہم سے بیس لاکھ یعنی دو ملین، کچھ دس ملین اور کچھ سو ملین نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اب تک لاکھوں کہکشاں دریافت ہو چکی ہیں اور ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے موجود ہیں۔

ماضی قریب میں ایک ایسی کہکشاں کا انکشاف ہوا ہے جو ہم سے پانچ ہزار ملین نوری سال کے فاصلے پر موجود ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۲۵

ارشاد ربانی ہے:

فلا اُقسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُومِ ۝ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝[1]

میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی اور اگر تم سمجھو تو یہ یقیناً بہت بڑی قسم ہے۔

خدایا! ہم تیری عظمت اور تیری مخلوقات کی عظمت کو کیا سمجھیں! ہاں! جس حد تک ہم نے سمجھا اور جانا ہے، واقعاً یہ تیری بہت بڑی قسم ہے۔

**آسمانوں کی زندہ مخلوقات:** اگرچہ سائنسدانوں کو یہ توقع ہے کہ دیگر سیاروں پر زندگی کے آثار موجود ہو سکتے ہیں لیکن آج تک انسان سوائے ظن وتخمین کے کسی آسمانی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا مگر قرآن نے پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ آسمانوں میں زندہ مخلوقات موجود ہیں:

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَ هُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۝[2]

اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور وہ جاندار جو اس نے ان دونوں میں پھیلا رکھے ہیں اس کی نشانیوں میں سے ہیں اور وہ جب چاہے انہیں جمع کرنے پر خوب قادر ہے۔

اس آیہ شریفہ میں ان مخلوقات کے آئندہ ایک جگہ جمع ہونے کی پیشین گوئی بھی ہے۔ لہٰذا جب انسان آسمانی مخلوق سے آشنائی پیدا کرے گا اور یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں گے تو اس وقت قرآن مجید وَ هُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ کے الفاظ میں تازہ ترین معجزہ پیش کر رہا ہوگا۔

**کائنات کی وسعت:** یہ کائنات متناہی ہے یا لامتناہی۔ یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن اب تک انسان نے اس کائنات کی وسعت کے بارے میں جو علم حاصل کیا ہے، وہ اگرچہ حقیقت کائنات کے مقابل تو ہیچ ہے، لیکن پھر بھی اس سے کائنات کا ایک عظیم نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس وسیع کائنات میں ابھی کئی کہکشائیں ایسی بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک نہیں پہنچی۔ یعنی کھربوں سال سے ان کی روشنی مسافت طے کر رہی ہے مگر ابھی تک وہ زمین پر نہیں پہنچ سکی۔

علم فلکیات کا یہ نظریہ اب ماہرین کے ہاں مسلمہ قرار پا چکا ہے کہ یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور کہکشائیں ہم سے دور ہٹ رہی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں جب آئن سٹائن نے اضافت عمومی کی مساوات کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس نے ثابت کیا تھا کہ یہ کائنات یا تو سکڑ رہی ہے یا پھیل رہی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کے ماہرین کائنات کو ثابت اور غیر متحرک سمجھتے تھے۔ اس وقت نظریے کو اپنے نظریہ اضافت عمومی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے آئن سٹائن نے مجبوراً ''مستقل کائنات'' کا نظریہ قائم کیا جو خود اس کے اپنے نظریے

---

[1] ۵۶ واقعہ: ۷۵-۷۶ [2] ۴۲ شوریٰ: ۲۹

سے متصادم تھا۔ چنانچہ بعد میں اس نے خود اعتراف بھی کیا کہ میری زندگی میں یہ سب سے بڑی سائنسی غلطی کا ارتکاب تھا۔ بعد میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ کائنات بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور کہکشائیں دور ہٹ رہی ہیں اور مزید یہ انکشاف بھی ہوا کہ کسی کہکشاں کے دور ہٹنے کی رفتار اس فاصلے سے متناسب ہے جو ہمارے اور اس کہکشاں کے درمیان ہے۔

خالق کائنات نے اس کا پہلے ہی یوں اعلان کر رکھا ہے:

وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ○ [1]

اور آسمان کو ہم نے اپنی طاقت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں۔

گویا:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے مسلسل صدائے کُن فَیَکُون
(اقبال)

**مخمور آنکھیں:** آسمان کی خلاؤں میں روشنی مختلف رنگوں میں یوں رقص کیا کرتی ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں کسی جادو کا شکار ہوگئی ہیں۔

آرتھر کلارک نے اپنی کتاب ''انسان اور خلا'' میں اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے ایک باب مخصوص کیا ہے جس میں اس نے خلانوردوں کے بیانات تحریر کیے ہیں کہ جب وہ خلائے بسیط میں پہنچے تو انہوں نے وہ عجب رنگا رنگ، چمک دمک اور اس سے ایک ہم آہنگی دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور انہیں محسوس ہوا کہ گویا ان پر نشہ طاری ہوگیا ہے یا ان کے آنکھوں کو جادو کر دیا گیا ہے۔[2]

اب ذرا اس آیت کا ارشاد سنیے:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ○ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ○ [3]

اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ روز روشن میں اس پر چڑھتے چلے جائیں تو یہی کہیں گے: ہماری آنکھوں کو یقیناً مدہوش کیا گیا ہے بلکہ ہم پر جادو کیا گیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آیت کی تفسیر یہی ہے بلکہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خلا میں سب سے پہلے خلانورد کے الفاظ وہی تھے جو قرآن نے فرمائے ہیں

**مادہ اولین** :ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۴۷ [2] Man and Space by Arthur Clark [3] ۱۵ حجر: ۱۴۔۱۵

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ...[1]

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔

عرش خدا کا حاکمیت، تدبیریت کے معنوں میں لیا جانا ہی آیت کے سیاق وسباق سے مناسبت رکھتا ہے۔ یوں عرش خداوندی کے پانی پر ہونے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت، جب اللہ آسمانوں اور زمین کو بنا رہا تھا تو اس وقت اس کی حاکمیت وسلطنت پانی پر تھی۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک موقع پر سوال کیا گیا کہ عرشِ الٰہی کتنی مدت پانی پر رہا؟ تو آپ(ع) نے فرمایا:

لو ان الارض من المشرق الی المغرب و من الارض الی السماء حب خردل ثم کلفت علی ضعفك ان تحمله حبة حبة من المشرق الی المغرب حتی أفنیته لکان ربع عشر جزء من سبعین ألفِ جزء من بقاء عرش ربّنا علی السماء قبل ان یخلق الارض و السماء، ثم قال : انما مثلت لك مثالا۔[2]

اگر کرۂ ارض مشرق سے مغرب تک اور زمین سے آسمان تک رائی کے دانوں سے بھر دیا جائے اور پھر تیری ناتوانی کے باوجود تجھے یہ حکم ملے کہ ان دانوں کو ایک ایک کر کے مشرق سے مغرب تک لے جاؤ تو ان دانوں کو ختم کرنے پر جو وقت صرف ہوگا وہ ستر اجزا میں سے دس اجزا کا چوتھائی (اس مدت کا اٹھائیسواں) حصہ ہوگا جو مدت آسمان وزمین کی خلقت سے پہلے ''عرش خدا'' کو پانی پر گزری ہے۔ پھر فرمایا: میں نے تو تمہارے لیے صرف ایک مثال پیش کی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

وخلق الشیء الذی جمیع الاشیاء منه و هو الماء الذی خلق الاشیاء منه فجعل نسب کل شی ء الی الماء و لم یجعل للماء نسبا۔[3]

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے وہ مادہ خلق فرمایا جس سے تمام چیزیں وجود میں آئیں اور وہ پانی ہے جس سے سب چیزوں کو خلق فرمایا۔ اس طرح ہر چیز کی تخلیق پانی سے ہوئی اور پانی کسی چیز سے خلق نہیں ہوا۔

---

[1] ۱۱ھود: ۷ [2] البرھان فی تفسیر القرآن للبحرانی ٤ : ۸۰ ۔ بحار الانوار ۱۰: ۱۲۷ میں مختلف عبارت ہے۔
[3] اصول الکافی ۸ : ۹۴

**نطفۂ امشاج:** صلب پدر سے رحم مادر کی طرف مادہ منویہ کا سفر خدا شناسی اور خود شناسی کے لیے حیرت انگیز درس ہے۔ یہ امانت عظمیٰ جب صلب پدر سے آمادہ سفر ہوتی ہے تو مختلف غدود کو بڑی تیزی سے یہ پیغام ملتا ہے کہ راستے کو پیشاب کی عفونت وغیرہ کے مضر اثرات سے پاک کیا جائے۔ چنانچہ یہ غدود اپنے چھڑکاؤ کے ذریعے آن واحد میں تمام راستوں کی صفائی کرتے ہیں تاکہ یہ امانت صحیح طور پر اور سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

کروڑوں جرثوموں پر مشتمل یہ جماعت رحم میں موجود تخم کے پاس جانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان جرثوموں کو معلوم ہے کہ تخم رحم کے آخری سرے پر ایک نلی میں موجود ہے اور ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ادھر یہ تخم بھی اپنے تخم دان سے نکل کر اس نلی تک ایک سفر کر کے پہنچ جاتا ہے۔ جرثومے اور تخم دونوں کو معلوم ہے کہ یہ نلی ہی ان کا حجلۂ عروسی ہے۔ تخم کو خلیات کی ایک جماعت کی محافظت میں حجلۂ عروسی میں پہنچایا جاتا ہے۔ جرثوموں کی ایک معتد بہ تعداد تخم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی امید میں تخم میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ تخم میں داخل ہونے کے لیے تیز دھار سر کی ضرورت ہے، چنانچہ ایک جرثومہ اپنی نوک سر کے ذریعے تخم میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسی وقت دیگر تمام ناکام جرثوموں کا داخلہ ممنوع قرار پاتا ہے اور انہیں باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ تخم کامیاب جرثومے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اس کے ساتھ شادی رچاتا ہے اور اسے اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ واضح رہے انسان کے جسم میں موجود جسمانی خلیے کا مرکزہ ۴۶ کرموسومز (Chromosomes) پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک مستقل سیل (Cell) ہے، لیکن جنسی خلیے کے مرکزہ میں ۲۳ کروموسومز (Chromosomes) ہوتے ہیں جو جسمانی خلیے کا نصف ہیں۔ چنانچہ انسانی تخلیق کے لیے ایک مستقل سیل (نطفہ) تشکیل دینے کے لیے مرد و زن میں سے ہر ایک ۲۳ کروموسومز فراہم کرتے ہیں، جس سے ایک مستقل سیل بہ اصطلاح قرآن نطفہ امشاج (مخلوط نطفہ) وجود میں آتا ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝[1]

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں، پس ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا۔

**عفت و پاکدامنی:** جب ایک جرثومہ تخم میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں تو تخم کی پاکدامنی اور عفت دیکھیے کہ وہ کسی اور جرثومے کو قریب آنے کی اجازت نہیں دیتا اور دوسرے کروڑوں خواستگاروں پر اپنی جاذبیت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

امشاج کا لفظ جمع ہے اور اس کا مفرد مشج ہے۔ نطفۃ امشاج میں نطفۃ موصوف اور امشاج صفت ہے۔ امشاج جمع ہونے کی صورت میں نطفۃ کو بھی جمع مان لینا پڑے گا کیونکہ عربی گرائمر

---

[1] ۷۶ انسان: ۲

کے تحت مفرد کی صفت مفرد اور جمع کی صفت جمع ہی آتی ہے۔نــطــفة اس حالت کو کہتے ہیں جس میں ۲۳ پدرانہ اور ۲۳ مادرانہ کروموسومز کا ملاپ اور اختلاط ہو۔

لہٰذا جدید ترین نظریہ اس آیت کے ساتھ صحیح مطابقت رکھتا ہے۔

**مضغۂ غیر مخلقه:** ارشاد ربانی ہے:

| | |
|---|---|
| يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمۡ‌ؕ وَنُقِرُّ فِى الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ...[1] | اے لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں شبہ ہے تو (سوچو) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی تخلیق شدہ اور غیر تخلیق شدہ بوٹی سے تاکہ ہم (اس حقیقت کو) تم پر واضح کریں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک مقررہ وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ |

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

| | |
|---|---|
| فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا‌ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ‌ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَؕ[2] | پھر ہم نے لوتھڑے کو بوٹی کی شکل دی۔پھر ہم نے بوٹی سے ہڈیاں بنادیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔ |

مندرجہ بالا آیات کے مطابق انسان کے مراحل تخلیق یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| ۱۔تراب | مِّنۡ تُرَابٍ |
| ۲۔نطفۂ امشاج | مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ |
| ۳۔لوتھڑا (چمٹنے والا) | مِنۡ عَلَقَةٍ |
| ۴۔ بوٹی | مِنۡ مُّضۡغَةٍ |
| ۵۔ ہڈی | فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ عِظٰمًا |
| ۶۔گوشت | فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا |
| ۷۔خلق آخر | ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ |

**مضغۂ مخلقه:** مفسرین، مترجمین نے مُّخَلَّقَةٍ کا ترجمہ پوری اور غَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ کا ترجمہ

---

[1] ۲۲حج:۵　[2] ۲۳ مومنون:۱۴

ادھوری کیا ہے جو بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ مُّخَلَّقَةٍ اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ اس مُّضْغَةٍ کی صفت ہے جس سے انسان خلق ہو رہا ہے۔ ادھوری سے تو خلق نہیں ہوا کرتا۔

جدید نظریات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مُضْغَة کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک تو بچے کی تخلیق اور دوسرے اس کی حفاظت۔ مضغہ مخلقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچے کے اعضاء بنائے، جب کہ مضغہ غیر مخلقہ کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس کے لیے غذا کا انتظام کرے۔ چنانچہ ظلماتِ ثلاث میں بند اس نازک مخلوق کے لیے شش جہت سے غذا بہم پہنچائی جاتی ہے۔

مُضْغَة کے وسط میں ایک خاص شے ہوتی ہے جس نے آئندہ دماغ اور حرام مغز بننا ہوتا ہے اور اس کے پہلو میں چند قطعے ہوتے ہیں جن سے ریڑھ کی ہڈی تشکیل پاتی ہے۔ پھر پورے جسم کی ہڈیاں بنتی ہیں پھر ان پر گوشت کا لبادہ چڑھایا جاتا ہے۔ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

# جمع قرآن

کتابت اسلام سے پہلے۔ کتابت اسلام کے بعد۔
وسائل کتابت۔ قرآن میں کتابت کا ثبوت۔ کاتبان وحی۔ جمع و تدوین قرآن۔ حفظ قرآن۔ حافظان قرآن کی تربیت ۔ اجتماعی حفظ۔ قوت حافظہ ۔ حافظان قرآن کا مقام۔ نماز اور قرآن۔ تعلیم قرآن۔ دار القراء ۔ عشق قرآن ۔ دقیق نظر۔ تدوین قرآن۔ ترتیب آیات۔ ترتیب آیات و ترتیب نزول۔ ترتیب سورہ ہائے قرآن۔ جمع قرآن در عصر رسول (ص) ۔ فریضہ الٰہی۔ قرآن سے کتابت قرآن کا ثبوت۔ شیوۂ رسول (ص)۔ عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن ۔ اصحاب کا عرضۂ قرآن۔ ختم قرآن۔ جبرئیل کا دورہ قرآن۔ فاتحۃ الکتاب۔ قرآن کا دفعۃً نزول۔ تواتر قرآن۔ وصیت رسول (ص)۔ اصناف سورہ ہائے قرآن ۔ ترتیب آیات کا توقیفی ہونا۔ عصر رسالت میں قرآنی نسخے۔ جمع قرآن بعد از رسول (ص) ۔ چند حقائق ۔ تواتر قرآن اور دو گواہ ۔ زید بن ثابت۔ دیگر قرآنی نسخے ۔ مصحف علی (ع) ۔ وصیت رسول (ص)۔ نسخہ محمدی کی جمع و تدوین۔ اس نسخہ کی افادیت۔ یہ نسخہ امت کو پیش کیا گیا۔ یہ نسخہ کہاں ہے؟ اختلاف قراءت اور نسخہ ۔ یہ نسخہ ربعہ میں۔ تضادات۔ عصر حضرت ابوبکر میں جمع قرآن۔ عصر حضرت عثمان اور قرآن۔ آرمینیا کی جنگ۔ علمائے امت کا فیصلہ۔ کمیٹی کی تشکیل۔ سرکاری مداخلت۔ ایک حرف کا تغیر۔ حضرت عثمان جامع قرآن نہیں ہیں۔
حضرت علی (ع) کا مؤقف ۔ موجودہ قرآن ۔

**کتابت، اسلام سے پہلے:** اسلام سے پہلے عرب قوم کتابت اور تحریر و تدریس سے بالکل نابلد تھی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے مکہ میں صرف ایک فرد کتابت سے واقف تھا[1] جس کا نام حرب بن امیہ بن عبد الشمس تھا۔ دوران مسافرت اس نے مکہ سے باہر متعدد لوگوں سے کتابت سیکھی۔ ان میں بشر بن عبد الملک صاحب دومة الجندل بھی شامل ہے۔ یہ مکہ میں بھی آیا اور یہاں لوگوں کو کتابت سکھائی۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس کے اس عمل کو سراہتے ہوئے کہا:

ولا تجحدوا نعماء بشر علیکم و فقد کان میمون النقیبة ازهرا
اتاکم بخط الجزم حتی حفظتمو من المال ما قد کان شتی مبعثرا[2]

جب حضور (ص) کی بعثت ہوئی تو اس وقت مکہ میں سترہ افراد کتابت جانتے تھے۔

**کتابت اسلام کے بعد:** کتابت چونکہ حصول علم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسلام نے علم اور قلم کو باہم مقرون کیا۔ چنانچہ ابتدائے وحی میں جس چیز کا سب سے پہلے ذکر آیا ہے وہ قرائت، علم اور قلم ہیں:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾[3]

پڑھیے! اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔

حدیث نبوی (ص) میں ہے:

اذ کان یوم القیامة وزن مداد العلماء بدماء الشهداء فیرجح مداد العلماء علی دماء الشهداء۔[4]

قیامت کے دن علماء (کے قلم) کی سیاہی کا وزن شہداء کے خون کے ساتھ کیا جائے گا تو علماء (کے قلم) کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ وزنی ثابت ہوگی۔

جنگ بدر میں ساٹھ مشرکین قیدی بنے تو رسول اکرم (ص) نے ان قیدیوں میں سے ہر ایک کا فدیہ دس مسلمانوں کو کتابت سکھانا قرار دیا۔ یوں آپ (ص) نے کتابت اور خواندگی کو آزادی کا ہم پلہ قرار دیا۔ اس واقعہ سے اسلامی تمدن کی تشکیل اور اسلام اور علم کے درمیان رشتے کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے

---

[1] مناهل العرفان ۱: ۲۵۵ [2] زنجانی۔ تاریخ القرآن ص ۳۱ [3] ۹۶ علق: ۳۔۴ [4] الامالی للصدوق ص ۱۶۸

**وسائل کتابت:** عصر رسالت میں تدوین کتب اور رسل و رسائل کے لیے درج ذیل اشیاء لکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں:

۱۔ العسب ۔ کھجور کی چھال
۲۔ لخاف۔ سفید باریک پتھر
۳۔ رقاع ۔ چمڑے کے ٹکڑے
۴۔ کتف۔ بکری کے شانوں کی ہڈی
۵۔ قتب ۔ پالان کی لکڑی
۶۔ شظاظ۔ وہ لکڑی جس سے بورے کا منہ باندھتے ہیں
۷۔ اشار ۔ چیرے ہوئے تختے
۸۔ قضیم۔ سفید چمڑا
۹۔ رق۔ پتلا چمڑا
۱۰۔ حریر۔ ریشمی کپڑا
۱۱۔ قراطیس۔کاغذ

زیادہ تر کتابت کاغذوں اور چمڑوں پر ہوتی تھی۔ چنانچہ رسول اکرم(ص) کی طرف سے جاری شدہ امان نامے اور مختلف حکمرانوں کو لکھے جانے والے خطوط چمڑوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں چین کاغذ سازی میں سب سے آگے تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی کاغذ بنتا تھا جو یمن میں فروخت ہوتا تھا۔ رومی بھی کاغذ بناتے تھے جو شام میں بکتا تھا اور ایرانی بھی کاغذ تیار کرتے تھے۔ یہ عراق میں بھی ملتا تھا۔

زمانہ رسالتمآب(ص) میں مندرجہ بالا اشیاء پر کتابت ہوا کرتی تھی اور ان پر لکھے گئے قرآن کو صحیفہ کہتے تھے اور جب ان مختلف ٹکڑوں کو کتابی شکل میں جمع کیا جاتا تو اسے مصحف کہتے تھے۔

حضرت عثمان کے دور میں غیر سرکاری مصاحف کے جلا دیے جانے والے واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن کاغذوں پر تحریر کیا جاتا تھا۔

**مابین الدفتین:** کھال سے بنی ہوئی جلد کو دف کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اہم دستاویزات ان پر لکھی جاتی تھیں بعد میں کاغذ پر لکھا جانا شروع ہوا اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے چمڑے کی دو جلدوں کے درمیان باندھ دیا جاتا تھا۔ ان دونوں جلدوں کو دفتین اور ان میں محفوظ کیے گئے کتابت شدہ موضوع کو مابین دفتین کہا جاتا تھا۔

خود قرآن مجید سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ صدر اسلام میں کتابت کے لیے لچکدار اشیاء موجود تھیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ [1]

اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹتے ہیں۔

نیز ارشاد فرمایا:

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ ...[2]

اور (اے رسول) اگر ہم کاغذوں پر لکھی ہوئی کوئی کتاب بھی آپ پر نازل کرتے اور یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو بھی لیتے۔

مزید فرمایا:

اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [3]

جو تم کرتے تھے ہم اسے لکھواتے رہتے تھے۔

**قرآن میں کتابت قرآن کا ثبوت:** یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور(ص) کسی کاتب کو بلا لیتے اور لکھنے کا حکم فرماتے اور املاء کرانے کے بعد کاتب سے فرماتے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنائے۔ کاتب سنا دیتا۔ اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو آپ(ص) اس کی اصلاح فرما دیتے۔[4]

مشرکین مکہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رسول اکرم(ص) لکھوایا کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والی سورہ فرقان میں ارشاد ہوا ہے:

وَ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا [5]

اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھ رکھی ہیں اور جو صبح وشام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ آغاز نزول ہی سے قرآن ضبط تحریر میں آتا رہا ہے. چنانچہ ہجرت سے سات سال قبل نازل ہونے والی سورہ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً [6]

اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔

اور سورہ عبس میں خود قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ [7]

ہرگز نہیں! یہ (آیات) یقیناً نصیحت ہیں۔ پس جو چاہے انہیں یاد رکھے۔ یہ محترم صحیفوں میں ہیں۔ جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۱۰۴ [2] ۶ انعام: ۷ [3] ۴۵ جاثیہ: ۲۹ [4] مجمع الزوائد ص ۴۰ [5] ۲۵ فرقان: ۵ [6] ۹۸ بینہ: ۲
[7] ۸۰ عبس: ۱۱ تا ۱۴

مزید فرمایا:

وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ

قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی ایک کشادہ ورق میں۔

**کاتبان وحی:** قرآن مجید ایک درمیانے حجم کی کتاب ہے جو تیئس (۲۳) برسوں میں بتدریج قلب رسول (ص) پر نازل ہوتی رہی۔ بظاہر ایک دو کاتب اس کی کتابت کے لیے کافی تھے، لیکن صاحب تاریخ دمشق نے کاتبان کی تعداد تیئس بتائی ہے۔ بعض مورخین کے ہاں یہ تعداد ۴۳ یا ۴۵ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ حضرت علی (ع) اور مدنی زندگی میں حضرت زید بن ثابت کا نام سننے میں آتا ہے۔

مورخین نے جن ۴۳ یا ۴۵ افراد کے نام کاتبین وحی کے زمرے میں درج کیے ہیں، ان میں سے اکثر کے کاتب وحی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ بعض اصحابؓ جو کتابت و قراءت قرآن میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان میں سے کچھ کے بارے میں تو یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زمان رسول (ص) ہی میں قرآن جمع کر لیا تھا، ان کے نام کاتبین وحی کے فہرست میں نہیں ملتے۔ مثلاً انس بن مالك، منذر بن عمرو، اسيد بن حضر، رافع بن مالك، ابو عبيده بن جراح، سعد بن عبيد اور ابو الدرداء و غيرهم۔

اس کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ کاتبان وحی سے مراد وہ حضرات ہیں جو رسول اللہ (ص) کے لیے لکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر نسخہ محمدی (ص) کی تدوین کرنے کے لیے لکھتے تھے۔ ہر قرآن لکھنے اور اسے جمع کرنے والے کو کاتب وحی نہیں کہا جاتا تھا۔

ایک کاتب وحی عبدا للہ بن سعد بن ابی السرح مرتد ہو گیا تھا۔ یہ ان چھ افراد میں شامل تھا جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ (ص) نے حکم فرمایا تھا کہ انہیں ہر حال میں قتل کر دیا جائے۔ مگر اس کے رضاعی بھائی نے اسے امان دلوا دی۔

کاتب وحی ہونا چونکہ ایک قابل فخر مقام تھا اس لیے کچھ لوگوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنا نام بھی اس فہرست میں شامل کروا دیا۔ مثلاً معاویہ نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا، یعنی حضور (ص) کی وفات سے صرف دو سال چھ ماہ قبل وہ مسلمانوں میں شامل ہوا، مگر اس کے باوجود ابن حجر اپنی کتاب الاصابہ میں معاویہ کو کاتبین وحی میں شامل کرتے ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے یزید، ابوسفیان اور حصین بن نمیر (قاتل امام حسینؑ) کو بھی کاتبین وحی میں شامل کیا ہے۔

**جمع و تدوین قرآن:** قرآن کی جمع و تدوین نہایت اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔ اس پر سیر حاصل بحث و تحقیق کی ضرورت ہے کہ قرآن قلب رسول (ص) سے امت کی طرف کیسے منتقل ہوا؟ کیونکہ رسالتمآبؐ

---

۱ ۵۲ طور: ۱ تا ۳

کے وصال کے بعد پیش آنے والے سیاسی و اجتماعی حالات نے اس حقیقت کو بھی غیر واضح کر دیا کہ قرآن کی جمع و تدوین کی کیا صورت تھی؟ ذیل میں ہم اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

لفظ جمع کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ لوح قلب میں حفظ کر لینے کو بھی ''جمع'' کہتے ہیں۔ چنانچہ حفاظ قرآن کو جماع القرآن بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ آیات اور سورتوں کو بلحاظ ترتیب نزول کتابت کر کے کتابی شکل میں لانا۔

۳۔ آیات اور سورتوں کو بالترتیب کتابت کر کے کتابی صورت میں مدون کرنا۔

۴۔ متعدد قرائتوں میں سے صرف ایک قراءت پر ہی لوگوں کو متفق رکھنا۔

پہلے معنی کے مطابق قلب رسول اکرم(ص) اور قلوب آل و اصحاب رسول(ص) میں قرآن جمع اور محفوظ تھا۔

دوسرے معنی کے مطابق عصر رسالت(ص) میں جمع کردہ قرآن مختلف صحیفوں میں تحریر تھا۔

تیسرے معنی کے مطابق بھی عصر رسالتمآب(ص) میں قرآن جمع اور مدون ہوا تھا۔

چوتھے معنی کے اعتبار سے قرآن کو عصر حضرت عثمان میں ایک ہی قراءت پر مجتمع کیا گیا۔

اب ان موضوعات پر ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

**حفظ قرآن:** جمع قرآن بمعنی حفظ، عہد رسالت(ص) میں یقیناً ہوتا رہا ہے اس میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں اور نہ ہی کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔ البتہ ہم یاد دہانی کے لیے چند شواہد کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ جمع و حفظ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗۚ[1]

(اے نبی) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ان علینا جمعه و قرآنه علیك حتی تحفظه و یمكنك تلاوته فلا تخف فوت شی منه۔[2]

قرآن کا جمع کرنا اور آپ کو پڑھانا ہمارے ذمے ہے تاکہ آپ قرآن کی تلاوت کر سکیں لہٰذا آپ قرآن کے کسی حصے کے رہ جانے کی فکر نہ کریں۔

---

[1] ۷۵ قیامت: ۱۶۔ ۱۷ [2] تفسیر مجمع البیان للطبرسی ۱۰: ۵۰۴

نیز قرآن میں ارشاد ہوا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ○ [1]

اور آپ پر ہونے والی اس کی وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں اور کہدیا کریں: پروردگارا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ○ [2]

(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

حضور (ص) پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ (ص) وحی کے مکمل ہونے سے قبل ہی آیت کی تلاوت شروع کر دیتے تا کہ آیت رہ نہ جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم آپ کو پڑھائیں گے تو پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

۲۔ سینۂ رسول (ص) میں قرآن محفوظ ہونے اور اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے خود اپنے ذمے لینے کے بعد دوسرا مرحلہ سینۂ رسول سے امت کے سینوں میں اس کی منتقلی کا تھا۔ اس مرحلے میں تحفظ قرآن کو یقینی بنانے کے لیے رسول اسلام (ص) نے متعدد اقدامات فرمائے۔

**الف۔ حافظان قرآن کی تربیت:** رسالتمآب (ص) نے قرآن مجید کو امت کے سینوں میں منتقل کرنے کے لیے حافظان قرآن کی وسیع پیمانے پر تربیت فرمائی۔

چنانچہ عصر رسالت (ص) میں ہی حافظان قرآن کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ نام بنام انہیں شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ [3]

بعض محققین کے مطابق عصر رسول (ص) اور اس سے متصل زمانے میں حافظان قرآن کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

**اجتماعی حفظ:** جو لوگ پورے قرآن کو حفظ نہیں کر سکتے تھے وہ آپس میں مل کر قرآن کو تقسیم کر لیتے اور ہر فرد چند سورتیں حفظ کر لیتا تھا اور بعد میں مل کر ختم قرآن کرتے تھے۔ [4]

مستشرق بلاشر حفظ قرآن اور جمع قرآن میں اشتباہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حافظان قرآن کی تعداد سات سے زیادہ نہیں تھی، حالانکہ متعدد روایات سے جامعین قرآن کی تعداد عصر رسالت (ص) میں سات معلوم ہوتی ہے، جب کہ حافظان قران کی تعداد تو حد و شمار سے باہر ہے۔

چنانچہ سن ۴ ہجری میں رسول اللہ (ص) نے قبیلہ بنی عامر کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے اپنے اصحاب میں سے ستر افراد کو روانہ فرمایا تھا جو سب کے سب حافظان قرآن تھے۔ حافظان قرآن کا یہ قافلہ جب بئر معونہ کے مقام پر پہنچا تو کفار نے انہیں گھیر کر سب کو شہید کر دیا۔ اس واقعے سے حضور (ص) کو اس

---

[1] ۲۰ طہٰ: ۱۱۴ [2] ۸۷ اعلیٰ: ۶ [3] البیان امام خوئی ص ۲۴۶ [4] رامیار ۔ تاریخ القرآن

قدر صدمہ ہوا کہ آپ(ص) ایک ماہ تک قنوت نماز میں قاتلوں پر نفرین فرماتے رہے۔ یہیں سے نماز میں قنوت بھی سنت قرار پائی۔

اسی سال حضور(ص) نے دس حافظان قرآن کو بنی عضل و قارہ میں قرآن کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا۔ جب یہ لوگ رجیع کے مقام پر پہنچے تو کفار نے انہیں گھیر لیا اور شہید کر دیا۔ اسی طرح غزوہ احد میں چوہتر (۷۴) مسلمان شہید ہوئے جن میں خاصی تعداد حافظان قرآن کی تھی۔

حضرت ابوبکر کے عہد حکومت میں جنگ یمامہ میں ستر (۷۰) حافظان قرآن شہید ہوئے تھے۔ جب کہ ایک اور روایت کے مطابق ان کی تعداد چار سو تھی۔ لیکن ابن کثیر کا خیال ہے کہ یہ تعداد پانچ سو تھی۔[1]

بعض مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ صفین میں تیس ہزار (۳۰۰۰۰) قاریان قرآن شریک تھے۔[2]

**قوت حافظہ:** عربوں کی قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ ساٹھ ستر بند پر مشتمل اشعار دو یا تین مرتبہ سننے کے بعد حفظ کر لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سادہ، غیر متمدن اور صحرائی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زندگیوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی اور نہ ہی اس سادہ اور باقی دنیا سے منقطع ماحول میں ان کے اذہان میں معلومات کا کوئی اژدھام تھا۔ اس لیے قرآن پاک جیسے پرکشش اور روح پرور کلام کا حفظ کرنا ان کے لیے نہایت آسان کام تھا۔

**حافظان قرآن کا مقام:** عصر رسالتمآب(ص) میں حافظان قرآن کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ چنانچہ اگر جنگ میں کوئی حافظ قرآن شہید ہو جاتا تو سب سے پہلے اسے دفن کیا جاتا تھا۔ امام جماعت کے لیے قراءت قرآن معیار تھا بلکہ اس سے بھی قابل توجہ بات یہ ہے کہ حفظ قرآن کے معیار پر سالار لشکر بنایا جاتا تھا۔

> جب رسول خدا (ص) نے اسامہ بن زید کو امیر لشکر بنایا تو بعض صحابہ نے تعجب کیا اور کہا کہ وہ اس نوعمری میں اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتا تو حضور (ص) نے اسامہ کے اس منصب کے اہل ہونے کے اوصاف بیان فرمائے جن میں سے ایک یہ تھا کہ اسامہ کو قرآن کا ایک حصہ حفظ ہے۔[3]

اسی طرح عثمان بن ابی العاص کو قرآن حفظ ہونے کی وجہ سے طائف کا امیر مقرر کیا گیا۔

**ب۔ نماز اور قرآن:** حضور(ص) نے تحفظ قرآن کو یقینی بنانے کے لیے اور اسے امت کے سینوں میں محفوظ رکھنے کے لیے قراءت قرآن کو نماز کے ساتھ جو کہ دین کا ستون ہے، مربوط فرمایا۔ چنانچہ خود رسالتمآب(ص) نمازوں میں بالعموم اور نماز تہجد کی صرف ایک رکعت میں بالخصوص سورہ بقرہ اور آل عمران

---

[1] فضائل القرآن ص ۹ [2] منقری ۔ صفین ص ۱۸۸ [3] ابن سعد طبقات ۲:۱۳۶ قسم اول

جیسی طویل سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے[1]۔ حذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک شب میں نے حضور (ص) کے ساتھ نماز پڑھی تو رسول اللہ (ص) نے سورہ بقرہ سے تلاوت شروع فرمائی۔ پھر سورہ نساء کی تلاوت فرمائی، پھر سورہ آل عمران کی تلاوت فرمائی۔ حضور (ص) نماز میں اس قدر قرآن کی تلاوت فرماتے تھے کہ پاؤں پر ورم آ جاتا تھا[2]

صرف نماز ہی میں نہیں بلکہ رات ہو یا دن جب بھی فرصت میسر ہوتی آپ (ص) قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی اور سواری کی پشت پر بھی تلاوت قرآن فرمایا کرتے۔[3] محاذ جنگ پر بھی آپ (ص) بآواز بلند تلاوت قرآن فرماتے تھے۔[4]

چنانچہ تلاوت قرآن کو سب سے افضل عبادت قرار دیا گیا۔

**ج۔ تعلیم قرآن:** دعوت اسلامی کے ساتھ ساتھ تعلیم قرآن کا عمل بھی نہایت اہتمام سے شروع ہوا۔ بیعت عقبہ کے بعد حضور (ص) نے مصعب بن عمیر کو مدینہ میں تعلیم قرآن کے لیے معلم قرآن کے طور پر متعین فرمایا۔[5]

بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ میں تعلیم قرآن کے لیے سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم مامور ہوئے۔ بعد میں عمار اور بلال کو تعلیم قرآن کے لیے بھیجا گیا۔[6]

مدینہ میں تعلیم قرآن کے عمل کو وسیع پیمانے پر آگے بڑھایا گیا اور معلم اول کے طور پر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب کرام کو بذات خود قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود نے کوفہ میں اپنے ساتھیوں سے کہا:

میں نے خود رسول اللہ (ص) سے ستر (۷۰) سورتیں پڑھی ہیں۔[7]

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں:

رسول اللہ (ص) ہمیں تشہد کی تعلیم اس طرح دیتے تھے جس طرح قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ابی بن کعب کہتے ہیں:

میں مسجد میں داخل ہوا تو ایک شخص قرآن پڑھ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا:

تمہیں کس نے قرآن پڑھایا؟ اس نے بتایا: خود رسول اللہ (ص) نے۔[8]

شیخ طوسی اپنی کتاب الامالی میں لکھتے ہیں کہ ابن مسعود نے ستر (۷۰) سورتیں خود رسول اللہ (ص) سے تعلیم پائیں اور باقی قرآن حضرت علی علیہ السلام سے۔[9]

---

[1] رامیار۔ تاریخ القرآن [2] صحیح البخاری: باب تہجد [3] و [4] رامیار: تاریخ قرآن ص ۲۲۴ بحوالہ مفتاح کنوز السنة
[5] ابن ہشام السیرة النبویة ۲: ۷۶ [6] زنجانی۔ تاریخ القرآن ص ۴۶ [7] تفسیر طبری ۱: ۲۸
[8] العطار، موجز علوم القرآن [9] الامالی للطوسی ص ۶۰۶۔ بحار الانوار ۸۹: ۷۲

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ (ص) اپنے شاگردوں کو قرآن پڑھانے کے بعد ان سے سنا بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اصحاب، رسول اللہ(ص) کی خدمت میں پورا قرآن بھی ختم کیا کرتے تھے۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ(ص) نے مجھ سے فرمایا:

اقرأ عَلَیَّ قال فَفَتَحْتُ سورة النساء ... الی آخر۔ — مجھے قرآن پڑھ کر سنا دو پس میں نے سورۂ نساء کو کھولا[1]

اور جب اس آیت پر پہنچا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا[2] — اس دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

تو رسول اللہ(ص) کی آنکھیں پرنم ہوگئیں اور فرمایا:

حسبك الآن ۔[3] — اب بس کرو۔

مسجد رسول(ص) ہمیشہ قاریانِ قرآن سے بھری رہتی تھی۔ یہاں تک کہ حضور (ص) کو کہنا پڑتا کہ لوگو! قرآن آہستہ پڑھو تا کہ آوازوں میں اختلاط پیدا نہ ہو۔

**دار القراء:** مدینے میں قاریان قرآن کی تعداد میں بکثرت اضافے سے مسجد اور صفہ میں گنجائش نہ رہی تو قاریانِ قرآن مخرمہ کے گھر جمع ہونے لگے۔ چنانچہ اس گھر کا نام ہی دار القراء پڑ گیا۔ یہ تاریخ میں سب سے پہلا دار القراء ہے۔

عبادہ بن ثابت ناقل ہیں کہ جب رسول اللہ(ص) خود تعلیم نہیں دیتے تھے تو ہم میں سے کسی کو حکم فرماتے کہ دور سے آنے والوں کو تعلیم قرآن دیں۔ (۴)

آپ(ص) نے تعلیم قرآن کو اس قدر اہمیت دی کہ عورتوں کے حق مہر بھی قرآن کی ایک یا چند سورتوں کی تعلیم قرار دی جانے لگی تھی۔

**عشق قرآن:** شاگردان رسول(ص) کے دلوں میں قرآن مجید نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ قرآن کی تلاوت جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایک واقعہ اس امر پر شاہد ہے:

> ایک جنگ میں ایک مسلمان نے ایک عورت کو اسیر بنایا جس کا شوہر موقعے پر موجود نہ تھا۔ شوہر کو جب پتہ چلا تو اس نے قسم کھائی کہ محمد(ص) کے ساتھیوں سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ چنانچہ وہ لشکر رسول (ص) کے تعاقب میں نکلا۔

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم عصر رسالتمآب میں کتابی شکل میں موجود تھا ورنہ ''کھولا'' کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔

[2] ۴ نساء : ۴۱ [3] مستدرك الوسائل ۴ : ۲۳۸ ۔العطار، موجز علوم القرآن ص ۴۶ [4] مسند احمد بن حنبل

ادھر رسول اللہ(ص) کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک درے میں رات گزارنے کاارادہ تھا۔ چنانچہ آپ(ص) نے حضرت عمار اورعباد بن بشر انصاری کو درے کی محافظت سونپی۔ دونوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ آدھی رات عباد محافظت کریں گے اور باقی آدھی رات عمار۔ چنانچہ عمار آرام کرنے لگے اور عباد عبادت میں مشغول ہو گئے ۔ وہ کافر مسلمانوں کے تعاقب میں اس درے تک پہنچ گیا۔ اس نے عباد کو نماز کی حالت میں دیکھ کر ایک تیر ان کی طرف پھینکا جو ان کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ عباد نے تیر کو جسم سے نکالا اور نماز کو جاری رکھا ۔ اس کافر نے ایک اور تیر پھینکا، وہ بھی ان کے جسم میں پیوست ہو گیا ۔ انہوں نے اسے بھی جسم سے نکالا مگر نماز جاری رکھی۔ جب تیسری بار بھی تیر لگا تو عباد نے جلدی جلدی سے رکوع وسجود کو پورا کیا اور عمار کو بیدار کیا۔ ان کے بیدار ہوتے ہی کافر نے راہ فرار اختیار کی۔ عمار نے اپنے ساتھی کو خون میں لت پت دیکھ کر کہا کہ مجھے شروع میں ہی بیدار کر لیتے۔ عباد نے جواب دیا: میں قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اور اسے قطع کرنا میرے لیے ناگوار تھا، لیکن جب تیر پے درپے آنا شروع ہوئے تو میں نے نماز جلدی تمام کی اور آپ کو بیدار کیا۔ خدا کی قسم اگر حکم رسول(ص) کی خلاف ورزی کا خوف اور قوم کی پاسبانی میں کوتاہی کا ڈر نہ ہوتا تو چاہے میری جان چلی جاتی میں سورت کی تلاوت کو قطع نہ کرتا۔[1]

**دقیق نظر**: عمر بن عامر انصاری راوی ہے کہ حضرت عمر نے اس آیت کی یوں تلاوت کی:

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ....[2]

اس میں انہوں نے الانصار کی راء کو پیش دے دیا اور الذین سے پہلے واؤ کا ذکر نہ کیا تو حضرت زید بن ثابت نے تصحیح کی اور وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ پڑھا تو حضرت عمر نے کہا: امیر المؤمنین بہتر جانتے ہیں اور کہا ابی بن کعب کو بلایا جائے۔ ابی بن کعب سے دریافت کیا تو انہوں نے واؤ کے ساتھ و الذین پڑھا، تو دونوں نے ایک دوسرے کی ناک کی طرف اشارہ کیا، تو اُبی نے کہا: خدا کی قسم رسول اللہ(ص) نے یہ آیت اس وقت مجھے پڑھائی

---

[1] حیات القلوب ۲:۳۸۹ و رامیار، تاریخ القرآن ص ۲۴۱ [2] ۹ توبہ: ۹۹

جب تو گندم بیچ رہا تھا۔[1]

عصر رسول(ص) کے مؤمنین جب رسول اللہ(ص) سے ایک آیت یا سورہ سنتے تو اسے بار بار پڑھتے، پھر رسول خدا (ص) کی خدمت میں حاضر ہو کر سناتے اور تصدیق کراتے۔ چنانچہ خارجہ بن زید نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ(ص) مدینہ تشریف لائے تو اس وقت تک میں نے سترہ سورتیں یاد کر لی تھیں۔ میں نے وہ رسول اللہ(ص) کی خدمت میں پڑھیں تو آپ نے تحسین فرمائی۔[2]

**تدوین قرآن:** کوئی کلام کسی متکلم کی طرف اس وقت منسوب ہوسکتا ہے جب کلمات اور ان کی ترکیب وتنظیم اس کی طرف سے ہو۔ اگر منتشر کلمات کسی طرف سے اور تنظیم وترتیب کسی اور کی جانب سے ہو تو یہ کلام اس کا شمار ہوگا جس نے اسے ترتیب دیا ہوگا۔

اسی طرح قرآن مجید کے کلمات بھی اللہ کی جانب سے ہیں اور ان میں موجود ترتیب وتنظیم بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، بلکہ قرآن کے معجزۂ الٰہی ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ قرآن کے کلمات اور اس کی ترتیب واسلوب میں وہ ہم آہنگی ہے جو کسی بشر سے صادر ہونا ممکن نہیں۔

لیکن کس قدر مقام افسوس ہے کہ اس کے باوجود غیر شیعہ علماء فرماتے ہیں:

عبداللہ بن مسعود نے کہا: سورہ قارعہ میں العهن کی جگہ الصّوف پڑھ سکتے ہیں۔[3]

اسی طرح وہ حضرت ابوبکر کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

جاء سكرة الموت بالحق کی جگہ جاء سكرة الحق بالموت پڑھ سکتے ہیں۔[4]

یا

طعام الاثيم کی جگہ طعام الفاجر پڑھا جا سکتا ہے۔[5]

یہاں تک کہ مؤلف کتاب المصنف نے جلد ۱۱ کے ص ۲۱۹ پر یہ تک کہہ دیا کہ بغرض وضاحت کلمات قرآن تبدیل کرنا جائز ہے۔

**ترتیب آیات:** قرآن کے جمع وترتیب کے چند مراحل ہیں۔ چونکہ قرآن سورہ سورہ نازل نہیں ہوا بلکہ آیہ آیہ نازل ہوا ہے، لہٰذا جمع وترتیب میں پہلے آیات کی ترتیب پر تحقیق کی جانی چاہیے بعد ازاں سورتوں کی ترتیب پر۔

اس بات پر نہایت قابل توجہ دلائل موجود ہیں کہ ترتیب آیات توقیفی ہے یعنی بحکم خدا خود رسول

---

[1] زنجانی۔ تاریخ القرآن ص ۴۳ [2] حوالہ سابق ص ۴۵ [3] ابن قتیبہ۔ تاویل مشکلات القرآن ص ۱۹
[4] تفسیر الطبری ۲۶: ۱۶۰ [5] تفسیر الطبری ۲۶: ۱۰۰

اکرم (ص) کی طرف سے آیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور یہی ترتیب بہ تواتر ہم تک پہنچی ہے:

۱۔ حضور (ص) کاتبانِ وحی کو صرف آیات کی کتابت کا حکم نہیں دیتے تھے بلکہ ساتھ ہی ترتیب بھی بتا دیتے تھے کہ کس آیت کو کس جگہ لکھنا ہے۔

ابن عباس راوی ہیں:

کان جبرئیل اذا نزل علی النبی بالوحی یقول له ضع هذه الآیة فی سورة کذا فی موضع کذا۔[1]

جب جبرئیل وحی لے کر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھیے۔

ابن عباس ہی سے روایت ہے:

فکان اذا نزل علیه الشیء دعا من کان یکتب فیقول:ضعوا هذه الآیات فی السورة التی فیها کذا و کذا۔[2]

جب حضورؐ پر وحی نازل ہو جاتی تو کاتب کو بلا کر فرماتے: ان آیات کو اس سورے میں رکھا جائے جس میں فلاں فلاں (چیز کا) ذکر ہے۔

ابن عباس اور سدی کے نزدیک سب سے آخری آیت وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ....[3] ہے مگر جبرئیلؑ یہ حکم لائے کہ اسے سورۂ بقرہ کی دوسواسّی ویں آیت کے بعد لکھا جائے۔[4]

احمد بن حنبل اپنی مسند میں ایک صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں:

میں رسول خدا (ص) کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ حضور (ص) نے اپنی نگاہ اوپر اٹھائی، پھر نگاہ سیدھی کر کے فرمایا: ابھی میرے پاس جبرائیل نازل ہوئے اور یہ حکم سنایا کہ میں آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی.[5] کو اس سورے کے فلاں مقام پر رکھوں۔ چنانچہ آپ نے اس آیت کو سورۂ نحل میں آیۂ شہادت اور آیہ عہد کے درمیان ثبت کر دیا۔[6]

۲۔ اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آیہ کی تعیین وتحدید کہ فلاں جملہ ایک مکمل آیہ ہے یا نہیں، توقیفی ہے۔ یعنی رسول کریم (ص) کے ارشاد پر موقوف ہے کہ فلاں عبارت ایک مکمل آیت ہے یا نہیں۔ کسی اجتہاد اور رائے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

چنانچہ الٓمّٓ، حٰمٓ، الٓمّٓصٓ، کٓهٰیٰعٓصٓ اور طٰسٓمٓ حروف مقطعات ہیں اور یہ سب مستقل آیت شمار ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مستقل آیہ ہونے پر رسول کریم (ص) کی صراحت موجود ہے۔ جب کہ اسی

---

[1] و [2] تاریخ یعقوبی ۲: ۳۶ [3] ۲ بقرہ: ۲۸۱ [4] طبرسی مجمع البیان ۱: ۳۹۴ [5] ۱۶ نحل: ۹۰
[6] مسند احمد بن حنبل ۴: ۲۱۸۔ اسی مضمون سے قریب تر دیگر احادیث مسند احمد جلد اول ص ۵۷۔ ۶۹۔ سنن ابوداؤد ۱: ۲۰۹، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۲۱ پر ملاحظہ فرمائیں

قسم کے دوسرے حروف مقطعات مثلاً الٓرٰ ، طٰسٓ ، صٓ ، قٓ اور نٓ وغیرہ مستقل آیات نہیں ہیں۔ یہ نص وصراحت رسول (ص) ہے جس کی وجہ سے حٰمٓ ایک مستقل آیت ہے اور الٓرٰ اور طٰسٓ مستقل آیات نہیں ہیں۔ مزید برآں طٰسٓمٓ اور کٓهٰیٰعٓصٓ صرف ایک ایک آیت شمار ہوتی ہے، جب کہ حٰمٓ عٓسٓقٓ دو آیات شمار ہوتی ہیں حالانکہ یہ بھی حروف مقطعات ہی ہیں۔

۳۔ اس بات پر بھی تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ نماز میں جس سورے کی بھی تلاوت ہو اسے موجودہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ اگر یہ ترتیب ملحوظ نہ رکھی جائے تو نماز باطل ہے۔

اگر ترتیب توقیفی نہ ہوتی تو پھر اصولاً یہ مسئلہ اجتہاد پر مبنی ہوتا۔

۴۔ قرآنی سورتوں میں آیات کی تعداد کے بارے میں بھی رسول کریم (ص) کی طرف سے بعض صراحتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ مثلا سورۂ فاتحہ کے بارے میں کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے۔ پس عدد آیات توقیفی ہونے کی صورت میں ترتیب کا توقیفی ہونا بھی قرین عقل ہے۔

**ترتیب آیات و ترتیب نزول:** یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ قرآن میں آیات جس ترتیب سے درج ہیں وہ ترتیب نزولی کے مطابق نہیں ہے کیونکہ:

ترتیب نزولی، وقت نزول کے تقاضوں کے مطابق ہے اور ترتیب قرآن، نظام قرآن کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

اس کی وضاحت کے سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ شروع میں شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کے لیے ایک سال کی عدت واجب تھی اور پورا سال شوہر کے گھر سے نکلنا جائز نہ تھا نیز عورت کو شوہر سے میراث میں صرف ایک سال کا خرچہ ہی ملتا تھا۔ اس کا حکم اس طرح نازل ہوا تھا:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ [1]

اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک انہیں (نان ونفقہ سے) بہرہ مند رکھا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

مذکورہ بالا آیت کا حکم اسی سورہ کی اس سے پیشتر آنے والی ایک آیت کے ذریعے منسوخ ہو گیا جس میں ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ [2]

اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۴۰ [2] ۲ بقرۃ: ۲۳۴

ترتیب نزولی کے مطابق منسوخ پہلے اور ناسخ بعد میں نازل ہوئی ہے، جب کہ موجودہ ترتیب میں ناسخ کا پہلے اور منسوخ کا بعد میں ذکر ہے۔

۲۔ ابن عباس، سدی، جبائی اور بلخی کے مطابق آیہ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [1] کے بعد کوئی فرض حکم نازل نہیں ہوا۔ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ سدی کے الفاظ یہ ہیں:

لم ينزل بعدها حلال و لا حرام [2] اس آیت کے بعد حلال وحرام کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا. حالانکہ یہ آیت اب سورہ مائدہ میں درج ہے اور اس کے بعد بے شمار آیات احکام موجود ہیں.

۳۔ آیہ: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ... [3] صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں کے لیے حج کرنا ممکن ہوا، جب کہ یہ آیت سورہ بقرہ میں درج ہے جو کہ مدینے میں نازل ہونے والا سب سے پہلا سورہ ہے۔

۴۔ آیہ: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ... [4] بقولے سب سے آخر میں اتری ہے اور اگر سب سے آخر میں نہیں تو اواخر میں یقیناً ہے، جب کہ اب یہ سورہ بقرہ کی ۲۸۱ ویں آیت ہے۔

**ترتیب سورہ ہائے قرآن:** گزشتہ صفحات میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ قرآن کی آیات کی ترتیب عہد رسالت (ص) میں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور یہ بات بھی عیاں ہوگئی ہے کہ سورتوں کے نام اور ان کی آیات کی تعداد بھی اسی عہد بابرکت میں طے پا چکی تھی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

| | |
|---|---|
| و انما كان يعرف انقضاء السورة بنزول بسم اللّٰه الرحمن الرحيم ابتداء لاخرى [5] | کسی سورت کے ختم ہونے کا اس وقت پتہ چلتا تھا جب کسی اور سورت کی ابتدا کے لیے بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم نازل ہو جاتی تھی۔ |

لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا سورہ ہائے قرآن کی ترتیب توقیفی ہے؟ یعنی خود رسول اللہ (ص) نے بحکم خدا سورتوں کو ترتیب دیا ہے یا عصر رسالت (ص) کے بعد اصحاب نے اپنے اجتہاد سے انہیں مرتب کیا ہے؟

ایک نظریہ تو یہ ہے کہ چونکہ عصر رسالت (ص) میں ہنوز سلسلۂ وحی جاری تھا، اس لیے قرآن کو ایک

---

[1] ۵ مائدہ: ۳۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا.
[2] سیوطی ۔ الدرمنثور ۲: ۲۵۹ [3] ۲ بقرة: ۱۵۸۔ صفا و مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔
[4] ۲ بقرة: ۲۸۱ [5] مستدرك الوسائل ۴: ۱۶۵

مصحف کی شکل دینا قبل از وقت تھا۔ اس کام کو بعد از رسالت انجام پانا تھا۔ چنانچہ بعد میں اپنے اپنے سلیقے کے مطابق لوگوں نے سورہ ہائے قرآن کو مرتب کیا۔

اس پر مزید دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اصحاب کے پاس متعدد قرآن موجود تھے۔ ہر مصحف کی ترتیب دوسرے مصحف سے مختلف تھی اور کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کا مصحف ترتیب نزول کے مطابق تھا، جب کہ دیگر اصحاب کے مصاحف اس سے مختلف تھے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب و تدوین خود عہد رسالتمآب (ص) میں مکمل ہوگئی تھی۔ جس طرح آیات کی ترتیب آپ (ص) نے خود اپنی نگرانی میں مقرر فرمائی تھی، اسی طرح سورتوں کی ترتیب کو بھی آپ (ص) نے ہی مقرر فرمایا تھا۔ سید مرتضیٰ علم الھدی متوفی ۴۳۶ ھ فرماتے ہیں:

موجودہ شکل میں قرآن کی جمع آوری عصر رسالت (ص) میں ہی ہوگئی تھی۔

لیکن یہ موقف اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ترتیب سورہ ہائے قرآن توقیفی نہیں ہے ۔ کیونکہ سورہ ہائے قرآن کی ترتیب اور کسی سورے کے مقدم اور مؤخر ہونے میں نظم قرآن کے ساتھ ربط نہیں ہے۔ اس لیے نماز میں آیات کو موجودہ ترتیب کے ساتھ تلاوت کرنا ضروری ہے، جبکہ سورہ ہائے قرآن کو موجودہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی مؤخر سورہ نماز میں مقدم اور مقدم سورہ مؤخر کر کے بھی دوسری رکعت میں پڑھنا درست ہے۔

**جمع قرآن در عصر رسول** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: کہا جاتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مدون نہیں تھا، البتہ بعد از رسول (ص) عصر ابی بکر میں زید بن ثابت کی سربراہی میں صرف دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر جمع ہوا۔

اس نظریے پر ہم بعد میں تحقیقی نظر ڈالیں گے۔ پہلے ہم اس بات کی تحقیق کریں گے کہ کیا عصر رسالت (ص) میں قران کتابی شکل میں مدون تھا؟

اس بات پر بے شمار دلائل موجود ہیں کہ قرآن مجید عصر رسول (ص) میں ہی کتابی شکل میں مدون تھا۔ ہم ان میں سے چند ایک دلائل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

**۱۔ فریضۂ الٰہی:** جس طرح خود رسول کریم (ص) کو لوگوں کے گزند سے بچانے کا کام خداوند عالم نے خود اپنے ذمے لیا اور فرمایا:

وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ...[1] اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

بالکل اسی طرح قرآن کو جمع اور محفوظ کرنا اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا اور فرمایا:

---

[1] ۵ مائدہ: ۶۷

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ [1]

(اے رسول) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔

نیز یہ ارشاد الٰہی بھی ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ [2]

(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

**۲۔ کاتبان وحی:** قرآن مجید ایک متوسط حجم کی کتاب ہے جو ۲۳ سالوں میں رسول خدا پر نازل ہوئی۔ بظاہر ایک دو کاتب اس کی کتاب کے لیے کافی تھے مگر بعض مورخین کے ہاں اس کے کاتبوں کی تعداد چالیس تک بیان کی گئی ہے۔

رسول کریم (ص) وحی کو اہتمام کے ساتھ بالالتزام لکھوایا کرتے تھے۔ جو کچھ لکھا جاتا تھا کیا اسے ہر کاتب وحی اپنے ساتھ لے جاتا تھا؟ اور کیا قرآن متعدد کاتبان وحی کے پاس منتشر اور متفرق صورت میں موجود تھا؟ اور کیا رسول اللہ (ص) کے پاس قرآن مدون شکل میں موجود نہ تھا؟ یہ باتیں نہایت بعید از عقل و قیاس ہیں۔

کاتبان وحی سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ (ص) کے لیے کتابت کیا کرتے تھے۔ ذاتی طور پر اپنے لیے کتابت قرآن کرنے والوں کو کاتبان وحی کا منصب نہیں دیا جاتا۔

زید بن ثابت کہتے ہیں:

کنا حول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم نؤلف القرآن من الرقاع. [3]

ہم رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف ٹکڑوں سے قرآن کی جمع و تدوین کیا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ قرآن خانہ رسول (ص) میں موجود تھا اور آپ (ص) نے اپنی وفات کے قریب حضرت علی (ع) کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یا علی القران خلف فراشی فی الصحف و الحریر و القراطیس فخذوہ و اجمعوہ و لا تضیعوہ۔ [4]

اے علی (ع) قرآن میرے بستر کے عقب میں مختلف صحیفوں پر ابریشم اور کاغذوں کی صورت میں موجود ہے۔ پس اسے لے لو اور جمع کر لو اور اسے ضائع نہ ہونے دو۔

ابو عبد اللہ محاسبی کہتے ہیں:

خانہ رسالتمآب (ص) میں کچھ اوراق پائے گئے جن پر قرآن مجید تحریر تھا کسی نے

---

[1] ۷۵ قیامت: ۱۶۔ ۱۷ [2] ۸۷ اعلیٰ: ۶ [3] حاکم مستدرک ۲: ۳۴۹
[4] بحار الانوار: کتاب القرآن ۸۹: ۴۸۔ تفسیر قمی ۲: ۴۵۱

انہیں جمع کیا اور ایک دھاگے میں سب اوراق کو پرو دیا تا کہ کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔[۱]

**۳۔قرآن سے کتابت قرآن کا ثبوت:** مشرکین مکہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ رسول اکرم(ص) کاتبوں سے قرآن لکھوایا کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والے سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

وَ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۝[۲]

اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھ رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

دیگر قرآنی آیات سے بھی اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ آغاز نزول قرآن سے ہی قرآن ضبط تحریر میں آنے لگا تھا۔ چنانچہ ہجرت سے سات سال قبل نازل ہونے والے سورۂ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۝[۳]

اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔

اور سورۂ عبس میں فرمایا گیا:

كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۝[۴]

ہرگز نہیں! یہ (آیات) یقیناً نصیحت ہیں۔ پس جو چاہے انہیں یاد رکھے۔ یہ محترم صحیفوں میں ہیں جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں۔

اور سورۂ طور میں ارشاد الٰہی ہے:

وَالطُّوْرِ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ۝ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ۝[۵]

قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی، ایک کشادہ ورق میں۔

قرآن کی کتابت اور تدوین آغاز وحی کے ساتھ ہی مکہ میں ہی شروع ہو جانے پر خود قرآنی شواہد کے علاوہ بے شمار تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور(ص) کسی ایک کاتب کو بلا کر لکھنے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ املا فرمانے کے بعد کاتب سے فرماتے: ''جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنا دے''۔ کاتب سنا دیتا۔ اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو حضور(ص) اصلاح فرما دیتے۔[۷]

حضرت عمر نے اپنی بہن کے گھر میں دو صحیفے پائے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ ان صحیفوں کو کسی سے پڑھوایا اور انہیں سن کر اسلام قبول کیا۔

---

[۱] البرهان ۱: ۲۳۸۔ ان راویوں کا شیوہ امانت فی النقل کے خلاف ہے کہ اس ہستی (علی علیہ السلام) کا نام لینا گوارا نہیں کرتے جس نے قرآن کو ضائع ہونے سے بچایا ہے

[۲] ۲۵ فرقان: ۵ [۳] ۹۸ بینہ: ۲ [۴] ۸۰ عبس: ۱۱ تا ۱۴ [۵] ۵۲ طور: ۱ تا ۳ [۷] مجمع الزوائد

**۴۔ شیوۂ رسول:** رسول کریم (ص) اپنے ہمراہ ایسے کاتبین رکھتے تھے جو معاہدوں اور قرض وغیرہ کو ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کاتبوں کو حکم دیا گیا کہ صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کرنے والوں کے اسماء کا اندراج کر کے ایک فہرست مرتب کی جائے تو حضرت معاذ نے ایک ہزار پانچ سو افراد کے نام درج کیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور (ص) قرآن مجید سے کم اہمیت والی چیزوں تک کو ضبط تحریر میں لانے اور محفوظ کرنے کا اہتمام فرماتے تھے تو کیا آپ (ص) نے اس ابدی معجزے کی تدوین و کتابت کا انتظام نہیں فرمایا ہوگا۔

**۵۔ عصر رسول کے جامعین قرآن:** رسول کریم (ص) اور اصحاب کرام کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ قرآن مجید عصر رسالت مآب (ص) میں ہی جمع ہو چکا تھا۔ ہم ذیل میں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

**۱۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام:** آپ (ع) نے عہد رسالتؐ میں قرآن اپنے سینے میں حفظ کر لیا تھا اور جمع بھی کیا تھا۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

**۲۔ اُبی بن کعب بن قیس:** آپ کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج سے تھا۔ یہ کاتب و حافظ قرآن تھے۔ ان کا لقب سید القراء اور کنیت ابو المنذر تھی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اما نحن فنقرأ علی قراءۃ اُبی۔[1] — ہم ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں۔

صحیح بخاری اور الفہرست لابن ندیم میں انہیں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

**۳۔ معاذ بن جبل بن اوس:** یہ بھی انصار میں سے تھے اور حضور (ص) نے انہیں یمن میں تعلیم قرآن کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ صحیح بخاری اور فہرست میں انہیں بھی عصرِ رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

**۴۔ زید بن ثابت:** ان کا ہم آئندہ بھی ذکر کریں گے۔ یہ کاتب رسول (ص) تھے اور ان کا یہ قول مشہور ہے:

کنا عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع.[2] — ہم حضور (ص) کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف ٹکڑوں سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

دوسرے مصادر کے علاوہ صحیح بخاری اور الفہرست، الاتقان اور مناہل العرفان میں انہیں عصر

---

[1] اصول الکافی ۲: ۶۳۴ و وسائل الشیعہ ۶: ۱۶۳۔ فَنَقْرَؤُہٗ کے ساتھ [2] سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۵

رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

**۵۔ عبد اللّٰہ بن عمر:** نسائی نے صحیح سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر سے روایت درج کی ہے کہ انہوں نے کہا:

جمعت القرآن فقرأت به كل ليلة ، فبلغ النبی صلی الله عليه و آله وسلم فقال : اقرأه فی شهر۔[1]

میں نے قرآن جمع کیا اور ہر رات کو ختم کیا کرتا تھا۔ رسول اللہ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا: ایک ماہ میں ختم کیا کرو۔

**۶۔ ابو ایوب انصاری:** سیوطی نے الاتقان میں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر کیا ہے۔

**۷۔ ابو الدرداء:** صحیح بخاری اور الفہرست میں انہیں بھی عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

**۸۔ عبادہ بن صامت:** سیوطی نے الاتقان میں انہیں عصر رسالت کے جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

**۹۔ ابو زید ثابت بن زید بن النعمان:** صحیح بخاری اور الفہرست میں عہد رسول (ص) کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

**۱۰۔ سعد بن عبید انصاری:** انہیں الفہرست میں جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

**۱۱۔ عبید بن معاذ یا عتید بن معاذ جزری:** الفہرست میں عصر رسالت (ص) کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

**۱۲۔ مجمع بن جاریہ یا حارثہ:** الاتقان اور تاریخ القرآن زنجانی میں انہیں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

**۱۳۔ ام ورقہ بنت عبد اللّٰہ بن حارث:** رسول اللہ (ص) اس خاتون کو شہیدہ کہکر پکارتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں اس خاتون کو ان کے اپنے غلام اور کنیز نے شہید کر دیا۔ سیوطی نے الاتقان میں انہیں جامعین قرآن میں شمار کیا ہے.

**۱۴۔ سالم مولی ابی حذیفہ:** زرکشی نے البرہان میں انہیں عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

**۱۵۔ عبد اللّٰہ بن مسعود:** آپ قرآن کے جلیل القدر معلم ہیں۔ عصر رسول (ص) میں ہی آپ نے قرآن جمع کیا تھا۔[2]

---

[1] حوالہ سابق ۱: ۱۴۴۔ مناھل العرفان ۱: ۲۳۷ [2] البرہان ۱: ۲۳۹

۱۶۔عقبہ بن عامر: آپ کو البرہان میں عصر رسول(ص) کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے.

**۶۔ جبرائیل کا دورۂ قرآن:** امامیہ، غیر امامیہ روایات سے ثابت ہے کہ رسالتمآب (ص) ہر سال جبرئیل کے ساتھ قرآن کی بازخوانی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

سمعنا رسول اللّٰہ یقول: جبرئیل کان یعارضنی بالقرآن فی کل سنة مرة و انه عارضنی به العام مرتین و لا اراه الا و قد حضر اجلی۔[1]

ہم نے رسول اللہ(ص) کو فرماتے سنا کہ جبرئیل ہر سال ایک بار میرے ساتھ قرآن کا دورہ کیا کرتے تھے لیکن اس سال دو مرتبہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ میرا وقت وصال قریب ہے۔

صحیح بخاری کے باب فضائل القرآن میں دورۂ قرآن کے بارے میں جناب سیدہ فاطمہ زھراء (س) کی یہی روایت اس طرح منقول ہے:

قال مسروق: عن عائشة عن فاطمة علیها السلام[2]: اسرّ الیّ النبی صلی الله علیه (و آله) و سلم ان جبرئیل یعارضنی بالقرآن کل سنة و انه عارضنی العام مرتین الا حضر اجلی۔[3]

مسروق کہتے ہیں: حضرت عائشہ نے جناب فاطمہ(س) سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ (ص) نے مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا کہ جبرئیل ہر سال مجھ سے قرآن کا دورہ (باز خوانی) کرتے ہیں مگر اس سال انہوں نے مجھ سے دو بار دورہ کیا ہے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت روانگی قریب ہے۔

**۷۔ اصحاب کا عرضۂ قرآن:** اصحاب رسول(ص) میں سے جو حضرات قراءت قرآن میں ممتاز مقام رکھتے تھے وہ آپ(ص) کی خدمت میں قرآن مجید کا دورہ کیا کرتے تھے اور بازخوانی ہوتی تھی۔ آخری بازخوانی عرضۂ اخیر یا دورہ اخیر کے نام سے مشہور ہے۔

راغب، اُبی بن کعب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ لوگوں نے ان کی قراءت کو اس لیے قبول کیا کہ وہ آخری فرد تھے جنہوں نے رسول اللہ(ص) کی خدمت میں قرآن کی بازخوانی کی۔

ابن عباس کہتے ہیں:

میں رسول خدا (ص) کے آخری کلام اور عمل کو معیار قرار دے کر اسے اختیار کرتا ہوں۔

---

[1] بحار الانوار ۴۳: ۵۱۔ ارشاد القلوب ۱: ۳۳۔ الامالی للصدوق ص ۵۹۵۔ کنز العمال ج ۱۲ حدیث ۳۴۲۱۴

[2] واضح رہے کہ صحیح بخاری میں اٹھائیس (۲۸) مقامات پر جناب سیدہ کے اسم مبارک کے ساتھ ''علیها السلام'' درج ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر ائمہ اھل بیت کے اسمائے گرامی کے ساتھ بھی ''علیه السلام'' درج ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ صرف شیعہ ایسا کرتے ہیں، جہالت پر مبنی ہے

[3] صحیح بخاری ۴: ۱۹۱۱۔ باب کان جبرائیل یعرض القرآن۔

ابن مسعود کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ بھی عرضۂ اخیر میں موجود تھے۔

عرضۂ اخیر کا واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول کریم (ص) نے قرآن کو آخری شکل دے کر اسے امت کے حوالے کیا ہے۔

**۸۔ ختم قرآن:** اصحاب رسول(ص) میں ایسے افراد کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے جنہوں نے حضور (ص) کی خدمت میں قرآن ختم کیا۔ وہ خود انفرادی طور پر پورا قرآن ختم کیا کرتے تھے، جس کے لیے حضور (ص) نے مدت کا بھی تعین فرمایا کہ کتنی مدت میں قرآن کا ختم کرنا مناسب ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ حضور (ص) نے عبداللہ بن عمر سے فرمایا کہ ایک ماہ میں قرآن ختم کیا کرو۔

اس کے علاوہ عصر رسول (ص) کے مؤمنین اجتماعی طور پر بھی ختم قرآن کیا کرتے تھے۔ یعنی قرآن کی سورتوں کو آپس میں تقسیم کرتے اور ہر فرد چند سورے پڑھ لیتا اور یوں ختم قرآن ہو جاتا۔[1]

رسول اللہ(ص) کے حکم پر اصحاب، قرآن کو دس روز یا چھ روز یا کم سے کم پانچ روز میں بھی ختم کیا کرتے تھے۔[2]

اگر قرآن کتابی شکل میں ایک مجموعے کے طور پر لوگوں کے پاس نہ ہوتا تو صرف تلاوت کا ذکر ہو سکتا تھا، ختم قرآن کے الفاظ بے معنی ہوتے۔

رسول اکرم(ص) نے فرمایا:

احب الاعمال الی اللہ الحال المرتحل۔[3] — اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل الحال المرتحل ہے۔

روایت ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی ایک بار پوچھا گیا کہ بہترین عمل کیا ہے؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: الحال المرتحل۔ اس کی تشریح پوچھی گئی تو فرمایا:

فتح القرآن و ختمہ کلما جاء باوله ارتحل فی آخرہ۔[4] — قرآن کا کھولنا اور ختم کرنا۔ جب بھی قرآن کی ابتدا پر آیا، آخر کی طرف روانہ ہوا۔

شیخ طوسیؒ درج ذیل امور کو عدم تحریف قرآن کی دلیل سمجھتے تھے:

۱۔ ختم قرآن مجید کا ثواب۔

۲۔ قرآن کو ایک رات میں ختم کرنے کی ممانعت۔

۳۔ قرآن کو کم از کم تین روز میں ختم کرنے کی ہدایت۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں:

اصحاب کی ایک جماعت مثلاً عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب اور دیگر افراد نے

---

[1] رامیار: تاریخ القرآن [2] حوالہ سابق۔ بحوالہ ابن سعد [3] المحجۃ البیضاء ۲: ۲۶۴ [4] اصول الکافی ۲: ۶۰۵

رسول اللہ(ص) کی خدمت میں کئی بار قرآن ختم کیا تھا۔[1]

اس قسم کی متعدد دیگر روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن عصر رسول (ص) سے ہی کتابی شکل میں مدون تھا، جس کا ایک معین آغاز اور اختتام بھی تھا اور اس کے ختم کرنے کے آداب بھی بیان کیے گئے تھے۔

### ۹۔ فاتحۃ الکتاب:

- فاتحۃ الکتاب کے معنی ہیں دیباچۂ کتاب یا افتتاحیۂ کتاب۔
- یہ نام عصر رسول(ص) میں ہی اس سورے کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔
- قرآنی سورتوں کے نام خود رسول اللہ(ص) ہی معین فرمایا کرتے تھے۔

مندرجہ بالا امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عہد رسالت(ص) میں ہی ایک کتابی شکل میں مرتب تھا جس کا ایک افتتاحیہ بھی تھا۔

**۱۰۔ لفظ الکتاب کا اطلاق:** عہد رسالت(ص) میں قرآن الکتاب کے نام سے موسوم تھا اور خود قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر اسے الکتاب کہا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حدیث شریف میں بھی مجموعۂ قرآن کو الکتاب فرمایا گیا ہے۔

حدیث ثقلین میں، جو شیعہ اور سنی دونوں طرق سے متواتر ثابت ہے، حضور (ص) نے فرمایا:

انی تارك فیكم الثقلین كتاب اللّٰه و عترتی۔ — میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت۔

یہاں کتاب سے مراد یہی مجموعہ ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

نیز حضور (ص) نے اپنی وفات سے کچھ دیر قبل حضرت علی علیہ السلام سے جو کچھ بیان فرمایا اس کے بارے میں ابو رافع بیان کرتے ہیں:

ان النبی صلی اللّٰه علیه و آله و سلم قال فی مرضه الذی توفی فیه لعلی: یا علی! هذا كتاب اللّٰه خذه الیك۔[2] — رسول اللہ(ص) نے جس مرض میں آپ (ص) کا انتقال ہوا، اس میں علی(ع) سے ارشاد فرمایا: یا علی! یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔

یہاں بھی اس مجموعہ قرآن کو ''کتاب'' کہا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ بات واضح ہے کہ قرآن عہد رسالت(ص) میں کتابی شکل میں مرتب ہو چکا تھا۔

**۱۱۔ قرآن کا دفعۃً نزول:** حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ(ع) نے

---

[1] طبرسی مجمع البیان ۱: ۱۵ [2] التمہید ۱: ۲۲۷ و بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵

فرمایا:

اے مفضل! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ(ص) کو قرآن ماہ رمضان میں عنایت فرمایا تھا مگر اس کی تبلیغ وقت کی مناسبت پر موقوف تھی۔ رسول کریم(ص) امر و نہی کے مواقع پر قرآن کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ جبرئیل صرف اسی مقصد کے لیے نازل ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ [1] یعنی قرآن کو جلدی پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے۔ [2]

ابن عباس بیان کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| انہ انزل فی رمضان لیلة القدر جملة واحدة ثم انزل علی مواقع النجوم رسلا فی الشهور و الایام۔ [3] | قرآن ماہ رمضان میں دفعتاً نازل ہوا ہے اور اس کے بعد مختلف مواقع پر مہینوں اور دنوں میں بتدریج بھی نازل کیا گیا۔ |

ان احادیث سے اس نقطۂ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن عصرِ رسول اکرم(ص) میں ایک مجموعہ کی شکل میں موجود تھا۔

**۱۲۔ تواتر قرآن:** اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ یہ قرآن رسول کریم (ص) سے تواتراً نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچا ہے۔ تواتر کے لیے ضروری ہے کہ عصر رسول(ص) میں پورا قرآن اصحاب میں سے اتنی تعداد کے پاس موجود ہو جتنی کہ تواتر کے لیے ضروری ہے۔

اس سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن عصر رسالتمآب(ص) میں جمع ہو چکا تھا۔

**۱۳۔ وصیت رسول(ص) اَلقرآنُ خَلفَ فَرَاشِی:** رسول کریم (ص) نے حضرت علی علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ قرآن میرے بستر کے عقب میں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں مروی ہے:

| | |
|---|---|
| قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم لعلی علیه السلام: یا علی! القرآن خلف فراشی فی المصحف والحریر و القراطیس فخذوه واجمعوه و لا تضیعوه [4] | رسول اللہ (ص) نے حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا: اے علی! قرآن میرے بستر کے پیچھے مختلف صحیفوں، ریشمی کپڑوں اور کاغذوں پر موجود ہے آپ اسے لے جائیں اور جمع کریں اور ضائع نہ ہونے دیں۔ |

**۱۴۔ اصناف سورہ ہائے قرآن:** تفسیر عیاشی میں سعد الاسکاف سے مروی ہے:

| | |
|---|---|
| سمعت ابا جعفر علیه السلام | میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا کہ |

---

[1] ۷۵ قیامۃ: ۱۶ [2] بحار الانوار ۸۹: ۳۸ [3] سیوطی اتقان ۱: ۸۳ [4] بحار الانوار ۸۹: ۴۸

یقول: قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم : اعطیت الطوال مکان التوراة و اعطیت المئین مکان الانجیل، و اعطیت المثانی مکان الزبور، وفضلت بالمفصل سبع و ستین سورة ۔ [2]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: مجھے توریت کی جگہ طوال ، انجیل کی جگہ مئین سورتیں اور زبور کی جگہ مثانی عنایت کی گئی ہیں اور مزید مجھے سورہ ہائے مفصل [1] جو کہ ستاسٹھ سورتیں ہیں، عطا کر کے فضیلت دی گئی۔

یہی روایت معمولی فرق کے ساتھ اہل سنت کے ہاں بھی منقول ہے ۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ عصر رسول (ص) میں قرآن ایک کتابی شکل میں لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھا جس کے ابواب وفصول یعنی سورتوں کی تفصیل بھی لوگوں کو معلوم تھی۔

**۱۵۔ ترتیب آیات کا توقیفی ہونا:** یہ بات ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ آیات قرآن کی ترتیب توقیفی ہے۔ یعنی خود رسول اکرم (ص) نے بحکم الٰہی آیات قرآن کو اسی موجودہ ترتیب کے مطابق رکھا ہے اور اسی ترتیب سے آیات کو مرتب کرنے کا نام جمع قرآن ہے اور یہی ترتیب تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔

انصاف یہ ہے کہ صرف آیات قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن عصر رسول (ص) ہی میں مدوّن ہو چکا تھا۔ کیونکہ آیات قرآن کو ترتیب دینا ہی جمع و تدوین قرآن ہے نیز اس کا کوئی مدعی نہیں ہوسکتا کہ آیات قرآن کی ترتیب اجتہادی ہے، موجودہ ترتیب کے علاوہ کسی اور ترتیب سے قرآن کی تلاوت ہوسکتی ہے اور نظم آیات کی موجودہ حیثیت ضروری نہیں ہے ۔

**۱۶۔ عصر رسالت میں قرآنی نسخے:** فضائل قرآن، تلاوت قرآن، آداب تلاوت قرآن، احکام مصحف اور دیگر قرآنی موضوعات کے بارے میں واردشدہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عصر رسالت میں کتابی شکل میں مدون اور ہر شخص کی دسترس میں تھا۔

الف۔ حضور (ص) نے فرمایا:

تعلموا الکتاب و تعاهدوه و اقتنوه۔ [3]

کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کرو، اس کے ساتھ عہد باندھو اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھو۔

ب۔ حفظ کرنے کی نسبت قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرنے میں زیادہ ثواب ہے ۔ اس سلسلے میں امامیہ، غیر امامیہ کی کتب میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔

---

[1] طوال پہلی سات طویل سورتوں کو کہتے ہیں۔ مئین سو یا زائد آیات والی سورتوں کو کہا جاتا ہے۔ مثانی وہ سورتیں ہیں جو سو سے کم آیات والی ہوں۔ جب کہ مفصل آخر قرآن کی سورتوں کو کہا جاتا ہے۔

[2] فیر عیاشی ۱: ۲۵ [3] اعلام الدین ص ۱۰۰ ۔ اس میں اقتنوا کی جگہ افشو ہے۔

ج۔ خود قرآن کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

النظر فی المصحف عبادة[1] مصحف میں دیکھنا عبادت ہے۔

د۔ رسالتمآب (ص) نے مشرکین کے علاقوں میں قرآن مجید ہمراہ لے جانے سے منع فرمایا۔

ان کے علاوہ بیسیوں ایسی احادیث اور احکام موجود ہیں جو عصر رسالت (ص) میں قرآن کے کتابی شکل میں موجود ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

**جمع قرآن بعد از رسول (ص):** رسالتمآب (ص) کی رحلت کے بعد عصر ابی بکر میں جو جمع قرآن مشہور ہے، اس کے بارے میں ہم ارباب نظر اور صاحبان تحقیق کی خدمت میں چند حقائق پیش کرتے ہیں۔ صرف یقینی دلائل نے ہمیں ان حقائق کو پیش کرنے پر مجبور کیا ہے۔ امید ہے کہ تحقیقی ذوق اور مایۂ علمی رکھنے والے حضرات اس کی قدر کریں گے اور مذہبی تنگ نظری کی بنیاد پر ان حقائق کو مسترد نہیں کریں گے۔

سب سے پہلے ہم وہ مشہور قصہ بیان کرتے ہیں جس کا تذکرہ اسی سلسلے میں کیا جاتا ہے:

کہا جاتا ہے کہ جنگ یمامہ میں متعدد قاریان قرآن کی شہادت کے بعد حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے کہا: اے ابوبکر! اس جنگ میں بہت سے قاریان قرآن شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر دیگر جنگوں میں بھی یہی ہوتا رہا تو قرآن کا ایک معتد بہ حصہ ضائع ہو جائے گا۔[2]

چنانچہ حضرت عمر نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار تاکید کی کہ ہمیں قرآن کو جمع کرنا چاہیے۔

خود حضرت ابوبکر کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی ۔[3] حضرت عمر بار بار مجھ سے کہتے رہے۔

حضرت عمر کے اصرار پر حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت انصاری کو بلایا اور ان سے کہا:

انك رجل شابٌ عاقل لانتهمك قد کنت تکتب الوحی لرسول اللّٰه فتتبع القرآن فاجمعه ۔[4]

تم عقلمند اور قابل بھروسہ جوان ہو اور تم رسول اللہ (ص) کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔ جاؤ قرآن کی جستجو کرو اور اسے جمع کرو۔

زید نے ایک سوال اٹھایا اور حضرت ابوبکر سے کہا:

کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول اللّٰه۔[5]

آپ وہ کام کیسے کریں گے جسے رسول اللہ (ص) نے انجام نہیں دیا ہے۔[6]

آخرکار زید نے اس امر کی سنگینی کے اظہار کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ ایک

---

[1] مستدرك الوسائل ۹: ۱۵۳ [2] تا [5] بحار الانوار ۸۹: ۷۵

[6] مستشرقین مثلاً نولڈکے (Noldeke) وغیرہ اسی لیے یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ص) کے زمانے میں قرآن جمع نہیں ہوا تھا اور آپ قوم کو کوئی شے کتابی شکل میں نہیں دے کر گئے تھے۔ کیونکہ اگر قرآن رسول (ص) کے زمانے میں جمع شدہ اور کتابی شکل میں ہوتا تو ضیاع قرآن کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

پچیس رکنی کمیٹی تشکیل دی اور اعلان کیا کہ جس نے بھی رسول اللہ(ص) سے قرآن کا کچھ حصہ اخذ کیا ہو وہ ہمارے پاس جمع کرائے اور جب تک اس کے قرآن ہونے پر دو گواہ پیش نہ ہوتے ،وہ اسے قرآن کے طور پر قبول نہ کرتے سوائے خزیمہ بن ثابت انصاری کے کہ ان کی پیش کردہ آیتوں کو بلا گواہ قبول کرتے تھے کیونکہ رسول اللہ(ص) نے ان کی ایک گواہی کو دو گواہوں کا مرتبہ دیا تھا۔

اسی اثنا میں حضرت عمر یہ عبارت لے کر آئے:

الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجموھا البتة نکالاً من اللّٰہ

زید نے حضرت عمر کی پیش کردہ عبارت کو قرآن کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ حضرت عمر کے پاس مطلوبہ گواہ موجود نہ تھے۔[1]

اسی طرح زید بن ثابت نے جمع قرآن کا عمل مکمل کیا اور اس نسخے کو ایک صندوق میں یا بالفاظ روایت ایک ''ربعہ'' میں محفوظ کر لیا۔

**چند حقائق:** مذکورہ بالا واقعہ، جمع قرآن سے متعلقہ اہل سنت کی کتب میں بکثرت پایا جاتا ہے اور اسے ایک مسلمہ حقیقت خیال کیا جاتا ہے۔لیکن اس واقعے کے بارے میں چند حقائق کا ذکر ناگزیر ہے۔

**۱۔ تواتر قرآن اور دو گواہ:** اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور اگر تواتر سے ثابت نہیں تو قرآن نہیں ۔ زید نے دو گواہوں کی بنیاد پر قرآن جمع کیا اور حد یہ ہے کہ بعض آیات کے لیے دو گواہ بھی نہ تھے۔ چنانچہ صرف ایک گواہ کی بنیاد پر ہی بطور قرآن قبول کر لیا۔

دوسری بات جو اس سے لازم آتی ہے وہ ہے تحریف قرآن۔ کیونکہ یہاں بہت سی آیات ہیں جو دو سے زیادہ گواہوں سے ثابت ہیں، لیکن موجودہ قرآن میں ان آیات کا وجود نہیں ہے ۔ مثلاً آیہ رجم، سورہ الحفد اور سورہ الخلع وغیرہ ۔ پس ان کا شامل نہ کرنا جب کہ یہ بھی دو سے زائد گواہوں سے ثابت ہیں مذکورہ اسلوب کی رو سے تحریف قرآن ہے، جس کی تفصیل ہم تحریف کے موضوع میں بیان کریں گے ۔

**۲۔ زید بن ثابت:** حضرت ابو بکر نے اس تاریخی اور نہایت اہمیت کے حامل کام کی انجام دہی کے لیے حضرت زید کو ہی کیوں منتخب کیا ؟ زمانہ رسول (ص) میں جن افراد کو حفظ اور قراءت قرآن میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا اور بقول صاحب صحیح بخاری، جن شخصیات کی طرف تعلیم قرآن کے لیے رجوع کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ عبد اللہ بن مسعود، اُبی بن کعب ، معاذ بن جبل اور سالم ہیں۔ ان میں زید کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ابن مسعود کا مقام سب پر واضح تھا۔ اُبی بن کعب کو سید القراء کہتے تھے۔ معاذ بن جبل کو امام

---

[1] سیوطی۔الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۸

العلماء کا لقب ملا تھا۔ حضرت زید گو کتابت وحی میں شہرت رکھتے تھے مگر حفظ و قراءت میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔

ابو وائل کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے ہمارے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں انہوں نے کہا:

> کیا تم مجھے زید بن ثابت کی قراءت کی پیروی کرنے کو کہتے ہو جب کہ میں نے خود رسول اللہ(ص) کی زبان سے ستر سورتوں سے زائد اخذ کی ہیں۔ اس وقت زید بچوں کے ساتھ پھرتا تھا اور اس کے سر پر دو چوٹیاں ہوتی تھیں۔[1]

البتہ زید میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہیئت حاکمہ کو ان پر اعتماد تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار خود حضرت ابو بکر نے بھی کیا کہ لا نتهـــمك ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے۔ اس اعتماد کی وجہ یہ تھی کہ زید بن ثابت، انصار کا ایک فرد ہونے کے باوجود سقیفہ میں مہاجرین کے موقف کا حامی تھا۔ چنانچہ انہوں نے بروز سقیفہ اپنا سیاسی موقف ان الفاظ میں بیان کیا:

ان رسول اللّٰه كان من المهاجرين و كنّا انصاره و انما يكون الامام من المهاجرين و نحن انصاره۔[2]

خود رسول اللہ(ص) مہاجرین میں سے تھے اور ہم ان کے انصار تھے اور آج امام بھی مہاجرین میں سے ہوگا اور ہم ان کے انصار ہوں گے۔

شاید اسی سیاسی موقف کا اثر تھا کہ یہ نہایت ثروت مند ہو گئے اور اپنے پیچھے دیگر مال و دولت کے علاوہ ایک لاکھ دینار مالیت کا سونا اور چاندی بھی چھوڑا، جو کلہاڑے سے کاٹ کر تقسیم کیا گیا۔[3]

**۳۔ دیگر قرآنی نسخے:** سب سے اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ضیاع قرآن کا کوئی خطرہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کیونکہ اس وقت قرآن کے متعدد قابل توجہ نسخے امت کے ہاتھوں میں موجود تھے۔ چنانچہ ابن اثیر کہتے ہیں:

> دمشق میں اُبی بن کعب کا مصحف، حمص میں مقداد کا مصحف، کوفہ میں ابن مسعود کا مصحف اور بصرہ میں ابو موسیٰ کا مصحف موجود تھا۔ کچھ لوگوں نے تو اپنے اپنے قرآنی نسخوں کے نام بھی تجویز کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ابن مسعود کے مصحف کو دیباج القرآن اور ابو موسیٰ کے مصحف کو لباب القلوب کہا جاتا تھا۔[4]

ذیل میں ہم ان قرآنی نسخوں (مصاحف) کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضرت ابو بکر کے زمانے میں موجود تھے۔

**۱۔ مصحف علی** علیہ السلام: حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] سنن نسائی ۳: ۴۳۱۔ المصاحف ص ۱۵ [2] ابن عساکر۔ تہذیب ۵: ۴۴۶
[3] مسعودی مروج الذہب [4] مسعودی مروج الذہب

و لقد كنت اتبعه اتباع الفصيل اثر امه، يرفع لي في كل يوم من اخلاقه علما و يأمرني بالاقتداء به، ولقد كان يجاور في كل سنة بحراء فأراه ولا يراه غيري، ولم يجمع بيت واحد يومئذ في الاسلام غير رسول الله و خديجة و انا ثالثهما ، اري نور الوحي و الرسالة ، و اشم ريح النبوة، و لقد سمعت رنة الشيطان حين نزل الوحي عليه (ص) فقلت: يا رسول الله ما هذه الرنة؟ فقال: هذا الشيطان قد أيس من عبادته، انك تسمع ما اسمع و ترى ما أرى الا انك لست بنبي و لكنك وزيرٌ و انك لعلى خير۔[1]

اور میں آپ (ص) کے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے۔ آپ ہر روز میرے لیے اخلاق حسنہ کے پرچم بلند فرماتے تھے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور ہر سال کچھ عرصے کے لیے (غار) حرا میں قیام فرماتے تھے۔ وہاں آپ (ص) کو میرے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا تھا اس وقت رسول اللہ (ص) اور (ام المؤمنین) خدیجہ (س) کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چار دیواری میں اسلام نہ تھا اور میں ان میں کا تیسرا تھا۔ میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ جب آپ (ص) پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی، جس پر میں نے آپ (ص) سے پوچھا کہ یا رسول اللہ (ص) یہ آواز کیسی ہے؟ تو آپ (ص) نے بتایا: یہ شیطان ہے جو اب اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے۔ (اے علی) جو میں سنتا ہوں وہ تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں وہ تم بھی دیکھتے ہو، فرق بس اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو، بلکہ میرے وزیر و جانشین ہو اور یقیناً بھلائی کی راہ پر ہو۔



جبیر بن مطعم کہتے ہیں:

قال ابی مطعم بن عدی لنا و نحن صبیان بمكة: الا ترون حب هذا الغلام يعني علياً۔ لمحمد و اتباعه له دون ابيه۔[2]

مکہ میں ہمارے بچپنے کی بات ہے کہ ہمارے والد نے ہم سے کہا: اس بچے (علی) کو دیکھو، اسے محمد (ص) سے کتنی محبت ہے کہ اپنے باپ کو چھوڑ کر ان کی کیسی اتباع کرتا ہے۔

سلیمان بن اعمش راوی ہے:

قال علي: ما نزلت آية الا و انا

حضرت علی (ع) نے فرمایا: کوئی آیت ایسی نہیں اتری

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ ص ۵۳۳۔ شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید ۱۳: ۱۹۷ [2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ ۱۳: ۲۰۰

علمت فیمن نزلت و این نزلت و علی من نزلت، ان ربی وهب لی قلبا عقولا و لسانا طلقاً[1]

مگر یہ کہ مجھے علم ہے کہ کس سلسلے میں اتری اور کہاں اتری اور کس کے بارے میں اتری. یقیناً میرے رب نے مجھے ایک عقلمند دل اور فصیح زبان عنایت فرمائی ہے۔

نیز آپ (ع) نے یہ بھی فرمایا:

سلونی عن کتاب الله فانه لیس من آیة الا وقد عرفت بلیل نزلت ام بنهار أو فی سهل أو فی جبل۔[2]

مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھ لو کیونکہ کوئی آیت ایسی نہیں کہ جسے میں نہ جانتا ہوں کہ رات کو نازل ہوئی ہے یا دن میں اور میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

ابن مسعود کہتے ہیں:

ان القرآن انزل علی سبعة احرف ما منها حرف الا وله ظهر و بطن و ان علی بن ابی طالب عنده علم الظاهر و الباطن۔[3]

قرآن سات حروف (معانی) پر نازل ہوا ہے ان میں سے کوئی حرف ایسا نہیں جس کے لیے ایک ظاہر اور ایک باطن نہ ہو اور علی (ع) کے پاس ان حروف کے ظاہر اور باطن دونوں کا علم موجود ہے۔

**وصیت رسول** صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم: حضرت علی علیہ السلام ہی وہ واحد شخص ہیں جنہیں رسول اکرم (ص) نے قرآن کے بارے میں وصیت فرمائی۔ اگرچہ قرآن عصر رسالت (ص) ہی میں امت کے حوالے ہو چکا تھا اور پورا قرآن امت کے پاس موجود تھا لیکن اس کا محمدی نسخہ بیت مصطفیٰ (ص) میں محفوظ تھا۔ اس نسخے کے وارث علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔ اسی لیے رسالتمآب (ص) نے مرض الموت میں ارشاد فرمایا:

یا علی هذا کتاب الله خذه الیك، فجمعه علی فی ثوب فمضی الی منزله فلما قبض النبی صلی الله علیه وآله وسلم جلس علی فالفه کما انزل الله و کان به عالماً۔[4]

اے علی! یہ کتاب خدا ہے، اسے اپنے پاس لے جاؤ۔ چنانچہ حضرت علی (ع) اسے ایک کپڑے میں جمع کر کے اپنے گھر لے گئے۔ رسول اللہ (ص) کی وفات کے بعد آپ (ع) نے قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا جیسے اللہ نے اسے نازل فرمایا تھا اور آپ (ع) ہی اسے بخوبی جانتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه و آله

رسول اللہ (ص) نے حضرت علی (ع) سے فرمایا: اے

---

[1] تفسیر العیاشی ۱: ۱۷۔ بحار الانوار ۸۹: ۹۷
[2] تفسیر العیاشی ۲: ۲۸۳
[3] حلیة الاولیاء ابو نعیم الاصبهانی ۱: ۶۵
[4] بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵ و ۸۹: ۵۱۔ التمهید ۱: ۲۲۷۔

و سلم لعلی علیه السلام: یا علی! القرآن خلف فراشی فی الصحف و الحریر والقراطیس فخذوه و اجمعوه ولا تضیعوه ۔[1]

علی! قرآن میرے بستر کے پیچھے صحیفوں، ریشمی کپڑوں اور کاغذوں میں موجود ہے، آپ (ع) اسے لے جا کر جمع کر لیں اور ضائع نہ ہونے دیں۔

**نسخہ محمدی کی جمع و تدوین:** محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ(ص) نے رحلت فرمائی تو علی علیہ السلام نے فرمایا:

آلیتُ ان لا آخذ عَلَیّ ردائی الا لصلوٰة جمعة حتی اجمع القرآن. فجمعه۔[2]

میں نے قسم کھا لی ہے کہ میں نماز جمعہ کے علاوہ اپنی عبا زیب تن نہ کروں گا (گھر سے باہر نہ نکلوں گا) جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کر لوں۔ چنانچہ انہوں نے اسے جمع فرما لیا۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

اتفق الکل علی انه اول من جمعه۔[3]

سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو سب سے پہلے علی(ع) نے جمع کیا۔

اور زرقانی کہتے ہیں:

واذن لا یضرنا فی هذا البحث ان یقال :ان علیا اول من جمع القرآن بعد رسول الله ۔[4]

اور ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ رسول اللہ (ص) کے بعد سب سے پہلے علی(ع) نے قرآن جمع کیا ہے۔

**اس نسخہ کی انفرادیت:** عکرمہ کہتے ہیں

لواجتمعت الانس و الجن علی ان یؤلفوه ذلك التالیف ما استطاعوا[5]

اگر جن و انس جمع ہو کر اس طرح قرآن کی جمع و ترتیب کریں تو وہ نہیں کر سکتے۔

ابن جزی کلبی کہتے ہیں:

لو وجد مصحفه علیه السلام لکان فیه علم کثیر۔[6]

اگر مصحف علی علیہ السلام میسر آ جاتا تو ایک علم کثیر ہاتھ آ جاتا۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

لو اصبت ذلك الکتاب کان فیه علم۔[7]

اگر یہ کتاب میسر آ جاتی تو اس میں سے علم حاصل ہو جاتا۔

---

[1] تفسیر القمی ۲ : ۴۵۱۔ بحار الانوار ۸۹ : ۴۸ [2] السیوطی۔ الاتقان ۱ : ۵۹ [3] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ۱ ۲۷
[4] مناهل العرفان ۱ : ۲۴۷ [5] السیوطی۔ الاتقان ۱ : ۵۹
[6] التسهیل لعلوم التنزیل ۱ : ۴ [7] الطبقات الکبری ابو عبد الله البصری ۲ : ۳۳۸

شیخ مفید نے کتاب الارشاد میں فرمایا:

ان علیا قدم فی مصحفه المنسوخ علی الناسخ و کتب فیه تاویل بعض الآیات و تفسیرها بالتفصیل۔

حضرت علی (ع) نے اپنے مصحف میں منسوخ کو ناسخ پر مقدم رکھا تھا اور بعض آیات کی تاویل وتفسیر بھی تفصیل سے رقم کی تھی۔

فیض کاشانی نے کتاب الوافی میں لکھا ہے:

حضرت علی(ع) نے قرآن کی تفسیر، شان نزول آیات خود رسول اللہ(ص) کی املا سے لکھی تھیں۔

چنانچہ خود حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

ولقد جئتهم بالکتاب مشتملا علی التنزیل والتاویل۔[1]

میں ان کے پاس وہ قرآن لایا تھا جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھا۔

ان نصوص سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ صرف تنزیل پر منحصر نہ تھا، جیسا کہ باقی مصاحف ہیں۔ یعنی صرف قرآن کی آیات پر ہی مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں کچھ تفسیر و تاویل بھی تھی۔

**یہ نسخہ امت کو پیش کیا گیا:** حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کو زرد ریشم پر تحریر فرمایا اور ایک اونٹ پر لاد کر مسجد نبوی میں موجود اصحاب کے سامنے پیش کیا اور فرمایا:

قال رسول الله:انی مخلف فیکم ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا ، کتاب الله و عترتی اهل بیتی، و هذا الکتاب و انا العترة[2]

رسول اللہ(ص) نے فرمایا تھا کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب، دوسری میری عترت اہل بیت (ع)۔ لہٰذا یہ ہے کتاب اور میں ہوں عترت۔

جواب ملا: اگر آپ (ع) کے پاس کتاب ہے تو ہمارے پاس بھی کتاب ہے۔ چنانچہ آپ (ع) حجت تمام کر کے واپس تشریف لے گئے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ امت کے پاس قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہ ہو، اس کے باوجود اصحاب اس نسخہ محمدی کو رد کر دیں؟

اگر قرآن کا کوئی نسخہ امت کے پاس موجود نہ تھا تو اس نسخہ محمدی کو رد کرنا ناقابل فہم ہے اور اگر دیگر قرآنی نسخے موجود تھے تو یہ کہنا کہ قرآن زید بن ثابت نے جمع کیا، ناقابل فہم ہے۔

اگرچہ فی الواقع دونوں صورتوں میں اس نسخہ محمدی کو رد کرنا ایک المیہ ضرور ہے۔ زرقانی کہتے ہیں:

لا ضیر فی هذا البحث ان یقال: ان

اس بحث میں اس بات کے ماننے میں کوئی حرج

---

[1] آلاء الرحمن ۱: ۲۵۷ [2] بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵

علیا اول من جمع القرآن بعد رسول اللہ۔[1]

نہیں کہ رسول اللہ (ص) کے بعد سب سے پہلے علی علیہ السلام نے قرآن جمع کیا ہے۔

کس قدر مقام تعجب ہے کہ جس طرح مستشرقین یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن زمانہ رسول (ص) میں جمع نہیں ہوا تھا، لفظ جمع، سے جو بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ (ص) کے زمانے میں قرآن جمع ہوا تھا، حفظ مراد لیتے ہیں۔ یعنی عصر رسول للہ (ص) میں قرآن حفظ ہوا تھا، جمع نہیں ہوا تھا، بالکل اسی طرح بعض علمائے اسلام حضرت علی علیہ السلام کے جمع قرآن کے بارے میں جو روایات میں لفظ جمع آیا ہے اسے حفظ کے معنی میں لیتے ہیں۔ یعنی آپ (ع) نے سینے میں حفظ کر لیا تھا۔[2] تا کہ یہ ثابت ہی نہ ہو سکے کہ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن جمع کیا تھا اور اسے رد کیا گیا۔ و لیست ھذہ اول قارورۃ کسرت فی الاسلام، حالانکہ حضرت علی علیہ السلام نے نسخۂ محمدی کی تدوین کے بعد ایک اونٹ پر لاد کر مسجد نبوی میں اسے اصحاب کے سامنے پیش کیا تھا اور اس واقعے کو تمام مؤرخین نے لکھا ہے اور ڈاکٹر آتھر جفری بھی مانتے ہیں کہ علی (ع) نے قرآن کی تدوین فرمائی تھی۔[3]

**یہ نسخہ کہاں ہے؟:** پوری ذمہ داری کے ساتھ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب حضرت علی علیہ السلام کا مصحف کہاں ہے۔ لیکن ایسے کچھ نسخے محفوظ تھے یا ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک سے تحریر کردہ ہیں۔

ابن ندیم نے اپنی مشہور کتاب الفہرست میں لکھا ہے:

> میں نے اپنے زمانے ۳۷۷ ھ میں ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس قرآن کا ایک نسخہ دیکھا جس کے کچھ اوراق موجود نہ تھے۔ یہ قرآن حضرت علی ابن ابی طالب کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا اور یہ اولاد حسن میں پشت در پشت میراث میں چلا آ رہا ہے۔

مقریزی کہتے ہیں:

> ۵۱۶ ھ میں فاطمی وزیر مامون بطائحی نے ایک قرآن جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، جامع عتیق مصر میں محفوظ کر لیا۔[4]
>
> علاوہ ازیں ترکی میں کتابخانہ ایا صوفیہ میں حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک قرآن دو جلدوں میں موجود ہے۔
>
> نجف اشرف میں روضۂ امیر المؤمنین علیہ السلام میں ایک نسخۂ قرآن آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا جو بعد میں ضائع ہو گیا۔[5]

---

[1] مناھل العرفان ۱: ۲۴۷
[2] ملاحظہ کیجیے مقدمہ تفسیر بیضاوی وغیرہ
[3] مقدمہ المصاحف ص ۵
[4] خطوط مقریزی بحوالہ رامیار تاریخ القرآن ص ۳۷۴۔
[5] حوالہ سابق

جناب زنجانی اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھتے ہیں:

و رأیت فی شهر ذی الحجة سنة ۱۳۵۳ه فی دار الکتب العلویة فی النجف الأشرف مصحفاً بالخط الکوفی کتب علی آخره: کتبه علی بن ابی طالب فی سنة اربعین من الهجرة، لتشابه ابی و ابو فی رسم الخط الکوفی قد یظن من لا خبرة له انه کتب علی بن ابو طالب بالواو۔

۱۳۵۳ھ کے ماہ ذی الحجة الحرام میں نجف اشرف کے دارالکتب العلویہ میں خط کوفی میں ایک قرآن میں نے دیکھا جس کے آخر میں تحریر تھا کہ اسے ۴۰ھ میں علی ابن ابی طالب نے لکھا۔ کوفی رسم الخط میں ابی اور ابو تقریباً ایک جیسے ہی لکھے جاتے ہیں اس لیے بے خبر لوگ اسے ابوطالب پڑھتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے مصحف کے علاوہ درج ذیل اصحاب کے مصاحف لوگوں کی دسترس میں تھے۔

**۲۔ سالم مولیٰ:** سالم، ابو حذیفہ کی زوجہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ کا شمار اصحاب صفہ میں ہوتا ہے۔ آپ کا ایک مصحف تھا۔

**۳۔ ابو زید قیس بن سکن:** مالک بن انس کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول خدا (ص) کے زمانے میں ہی قرآن جمع کیا تھا۔

**۴۔ معاذ بن جبل:** ان کا مصحف شام اور حمص میں شہرت رکھتا تھا۔

**۵۔ ام ورقہ بنت عبد اللہ:** آپ نے بھی عصر رسول (ص) میں ہی قرآن جمع کر لیا تھا۔

**۶۔ سعد بن عبید:** یہ عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں شمار ہوتے ہیں۔

**۷۔ اُبی بن کعب:** ان کا لقب سید القراء اور کنیت ابو المنذر ہے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا شمار علمائے یہود میں ہوتا تھا اور کتب عہدین پر عبور تھا۔ ان کا مصحف سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے دوسرے مصاحف سے مختلف تھا۔

**۸۔ عبد اللہ بن مسعود:** یہ چھٹے شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی لیے انہیں سادس ستة یعنی چھ میں سے چھٹا کہتے تھے۔ ان کے مصحف کو نہایت شہرت حاصل تھی۔

**۹۔ ابو الدرداء:** ان کا شمار بھی عصر رسول (ص) کے جامعین قرآن میں ہوتا ہے۔

**۱۰۔ مقداد بن اسود:** ان کا قرآن حمص اور شام میں مشہور تھا۔

**۱۱۔ ابو موسیٰ اشعری:** ان کا مصحف بصرہ میں رائج تھا اور یہ خود بصرہ کے حاکم بھی رہ چکے تھے۔ ان کے

مصحف کولباب القلوب کہا جاتا تھا۔

**۱۲۔ حضرت حفصہ بنت عمر:** کہتے ہیں کہ حضرت حفصہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں ۔ انہوں نے بحکم رسول خدا (ص) حضرت لیلی بنت عبد اللہ بن عبد شمس سے کتابت سیکھی تھی۔ انہوں نے اپنے لیے ایک مصحف تیار کیا تھا۔ یہ اس مصحف کے علاوہ تھا جسے حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا اور حضرت عمر کی وفات کے بعد وہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔

**۱۳۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر:** متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ نے بھی اپنے لیے ایک مصحف تیار کرایا تھا اور اس میں کچھ آیات دوسرے مصاحف سے مختلف تھیں۔

**۱۴۔ حضرت ام سلمہ :** آپ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ آپ نے خود اپنے لیے ایک مصحف تیار کیا تھا۔

**۱۵۔ زید بن ثابت:** ان کا یہ مصحف اس مصحف کے علاوہ تھا جسے حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا۔ اس بات کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ زید رسول کریم (ص) کے حضور آخری دورۂ قرآن میں حاضر تھے۔ لہٰذا ان کا قرآن بھی عرضۂ اخیر میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

**۱۶۔ مجمع بن جاریہ:** کہتے ہیں کہ ان کا بھی اپنا ایک مصحف تھا۔ انہوں نے عہد رسول (ص) میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا۔ صرف دو سورتیں رہ گئیں تھیں جو انہوں نے بعد رسول (ص) حفظ کیں۔

**۱۷۔ عقبہ بن عامر:** ان کا بھی اپنا مصحف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصحف چوتھی صدی ہجری تک موجود تھا۔

**۱۸۔ عبد اللہ بن عمر:** ان کا شمار بھی زمانہ رسول (ص) میں قرآن جمع کرنے والوں میں ہوتا ہے.

**۱۹۔ انس بن مالک:** ان کا بھی اپنا ایک مصحف تھا۔

یہ ہیں وہ قرآنی نسخے جو عہد رسول (ص) میں جمع کر لیے گئے تھے۔ ان کی موجودگی میں ضیاع قرآن کا سرے سے کوئی خطرہ نہ تھا۔[1]

**اختلاف قراءت اور نسخہ:** سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابو بکر نے اپنے زمانے میں قرآن کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے زید بن ثابت سے قرآن جمع کروایا تھا تو یہ نسخہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں کیوں نہ تھا؟ کیونکہ بعد میں جب عہدِ عثمان میں قراءت کا اختلاف پیدا ہوا تو اس نسخے کے معاصر دوسرے نسخوں کا ذکر آتا ہے، مگر اس نسخے کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا کہ کچھ لوگ اس مصحف کے مطابق بھی قراءت کر رہے ہوں۔ جیسا کہ کہ دمشق میں ابی بن کعب کا مصحف، حمص میں مقداد کا مصحف، کوفہ میں ابن مسعود کا مصحف اور بصرہ میں ابو موسیٰ کا مصحف رائج تھا۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ قرآن ڈاکٹر رامیار

**یہ نسخہ ربعہ میں :** اگر قرآن کو ضیاع سے بچانا ہی مقصود تھا اور لوگوں کے پاس قرآن محفوظ نہ تھا تو زید بن ثابت کے سرکاری نسخے کو عام کرنا چاہیے تھا، جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ یہ نسخہ ایک صندوق میں بند رہا۔ بقول روایات ایک ربعہ میں بند کر دیا گیا۔ صرف حضرت عثمان کے دور میں ایک مرتبہ یہ نسخہ ربعہ سے نکالا گیا۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کے پاس آیا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت حفصہ کے پاس رہا۔ پھران کی وفات کے بعد مروان بن حکم والی مدینہ نے اسے جلا دیا۔[1]

شاید یہ نسخہ تیار کروانے کی اصل وجہ یہ ہو کہ دیگر اصحاب کے علاوہ حضرت علی (ع) کے پاس تو قرآن کا ایک جامع نسخہ موجود تھا، لیکن ہیئت حاکمہ کے پاس کوئی قرآنی نسخہ موجود نہیں تھا۔

اس سرکاری نسخے کے بارے میں مصر کے مشہور مؤلف ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز اپنی کتاب مدخل الی القرآن الکریم ص ۳۸ میں لکھتے ہیں:

و لکن رغم قیمة هذا المصحف العظیمة ورغم ما یستحقه من العنایة التی بذلت فی جمعه فان مجرد بقائه محفوظاً بعنایة عند الخلیفتین الاولین اسبغ علیه الطابع الفردی او الشخصی بعض الشیء و لم یصبح وثیقة للبشر کافة۔[2]

اس نسخے کی بہت بڑی قدر و قیمت اور اس کے جمع کرنے پر صرف ہونے والی توجہ قابل قدر ہونے کے باوجود اس نسخے کا صرف دونوں خلفاء کے پاس محفوظ رہنے سے اس پر ذاتی اور شخصی تأثر کسی حد تک قائم رہا اور تمام لوگوں کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت حاصل نہ کر سکا۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ کا تبصرہ بالکل درست ہے کہ اس نسخہ کا امت کے ساتھ کوئی ربط نہ رہا اور امت کے پاس اس نسخے کے علاوہ بہت سے نسخہ ہائے قرآن موجود تھے۔

**تضادات:** حضور (ص) کے بعد قرآن کے بارے میں جو روایات اہل سنت نے اپنی کتب میں بکثرت درج کی ہیں ، ان میں اس قدر تضادات موجود ہیں کہ کسی ایک روایت پر بھی اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ ان تضادات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کتاب البیان فی تفسیر القرآن کا مطالعہ کافی رہے گا جہاں اس موضوع کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں جنگ یمامہ میں چار سو قاریان قرآن شہید ہونے کی وجہ سے ضیاع قرآن کا خطرہ لاحق ہوا۔ تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ یمامہ میں تین ہزار قاریان قرآن شریک تھے۔ ان میں سے صرف چار سو کے شہید ہونے سے قرآن کے ضیاع کا خطرہ کیسے لاحق ہوسکتا ہے؟

**عصر ابوبکر میں جمع قرآن:** بالفاظ دیگر سرکاری نسخہ تیار کرنے کے واقعے سے مستشرقین کو یہ

---

[1] المصاحف ص ۲۱ ۔ ڈاکٹر جفرے مقدمہ المصاحف ص ۵ [2] ڈاکٹر جفرے مقدمہ المصاحف

موقع ملا کہ وہ یہ نظریہ قائم کریں کہ رسول خدا (ص) کی رحلت کے وقت کوئی نسخہ قرآن امت کے ہاتھوں میں موجود نہ تھا، ورنہ حضرت عمر اور حضرت ابو بکر کو ضیاع قرآن کا خوف لاحق نہ ہوتا۔[1]

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ضیاع قرآن کے خوف کا کوئی سبب موجود نہ تھا اور نہ ہی سرکاری نسخے نے قرآن کا تحفظ کیا ہے۔ البتہ اس خوف کی کوئی دوسری وجوہ ہوسکتی ہیں یا اس قول کی نسبت ان کی جانب درست نہیں کہ کسی خوف کا اظہار ہوا تھا۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ زہری کی اس روایت کو غیر معتبر اور دیگر حقائق سے متصادم ہونے کی وجہ سے مسترد کیا جائے۔

چنانچہ جناب صدیق حسن خان اپنی کتاب جمع و تدوین قرآن صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے غیر معتبر ہونے کے جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ انہیں بہ یک نظر مسترد کر دیا جائے۔

**عصر عثمان اور قرآن:** حضرت عثمان کے زمانے میں اسلام کرۂ ارض کے ایک وسیع خطے پر پھیل گیا تھا اور غیر عرب قومیں بھی اسلام میں داخل ہوگئی تھیں۔ دوسری طرف قرآن کی مختلف قرائتیں رائج تھیں اور اس وسیع و عریض مملکت کے ہر شہر اور ہر علاقے میں ایک قراءت رائج ہوگئی تھی۔ قراءت مختلف ہونے کا مطلب تلفظ میں اختلاف ہے۔ مثلاً یَطْهُرْنَ ایک قراءت ہے جس کا معنی ہے ''پاک ہونا'' جب کہ یَطَّهَّرْنَ دوسری قراءت ہے جس کا معنی ہے ''پاک کرنا''۔

**آرمینیا کی جنگ:** ان دنوں حضرت حذیفہ[2] (صاحب سر رسول(ص)) آذربائیجان میں جنگ آرمینیا میں شریک تھے۔ اس جنگ میں شام اور عراق کے سپاہی لڑ رہے تھے۔ شام والے اُبی بن کعب کی قرائت پر قرآن پڑھتے تھے اور عراق والے ابن مسعود کی قرائت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔ ہر ایک کو دوسرے کی قرائت اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اہل شام اور اہل عراق ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔

حضرت حذیفہ اس صورت حال سے خاصے پریشان ہو گئے وہ آذربائیجان سے سیدھے کوفہ آئے اور یہاں موجود اصحاب رسول(ص) سے اس مسئلے کے بارے میں مشورہ کیا۔ تمام اصحاب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ قرآن کی ایک ہی قرائت پر لوگوں کو مجتمع کیا جائے۔ صرف عبداللہ بن مسعود نے اختلاف کیا۔[3]

**علمائے امت کا فیصلہ:** یہ فیصلہ لے کر حضرت حذیفہ مدینہ پہنچے اور گھر جانے سے پہلے حضرت

---

[1] حوالہ سابق

[2] حضرت حذیفہ بن یمان عراقی الاصل تھے اور سابقین فی الاسلام میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ رسالتمآب (ص) کے رکابدار تھے۔ جب حضور (ص) جنگ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو منافقین کی ایک جماعت تاک میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر رسول (ص) خدا کو شہید کیا جائے، مگر اچانک بجلی چمکنے پر رسول خدا (ص) اور حذیفہ نے ان سب کو دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ حضور (ص) نے حضرت حذیفہ سے فرمایا کہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ چنانچہ حذیفہ وہ واحد صحابی تھے جو منافقین کو جانتے تھے اسی لیے انہیں صاحب السر کہا جاتا تھا۔

[3] ابن اثیر الکامل ۳: ۵۵

عثمان کے پاس حاضر ہوکر دہائی دی: میں ہی واحد پیغام لانے والا ہوں۔ میں خبردار کرتا ہوں۔ حضرت عثمان نے پوچھا: بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے فرمایا: اے خلیفہ! لوگوں کی فریاد کو پہنچو۔ حضرت عثمان نے پھر پوچھا: کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا:

لوگوں نے کلام خدا میں اختلاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مسلمانوں کا حشر بھی وہی نہ ہو جو یہود و نصاریٰ کا ہوا ہے۔

ابن اثیر لکھتے ہیں:

فجمع عثمان الصحابة واخبرهم الخبر، فاعظموه، ورأوا جميعا ما رأى حذيفة۔[1]

چنانچہ حضرت عثمان نے اصحاب کو جمع کیا اور انہیں اس خبر سے آگاہ کیا۔ اصحاب نے اس کو بڑا سانحہ قرار دیا اور سب نے حذیفہ کی تائید کی۔

**کمیٹی کی تشکیل:** چنانچہ اس مقصد کے لیے اصحاب رسول (ص) پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی.

حضرت عثمان نے اس کمیٹی سے کہا:

يا اصحاب محمدؐ اجتمعوا فاكتبوا للناس اماماً۔[2]

اے اصحاب محمد (ص)! متفق طور پر اس امت کے لیے ایک رہنما نسخہ تیار کرو۔

ابتدائی مرحلے میں چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۱۔ زید بن ثابت
۲۔ سعید بن عاص قرشی
۳۔ عبداللہ بن زبیر
۴۔ عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام[3]

زید بن ثابت اس کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کے ارکان علمی قابلیت کے فقدان کی وجہ سے اس عظیم کام کو سرانجام دینے سے عاجز رہے۔ چنانچہ نئی کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس میں درج ذیل افراد کو شامل کیا گیا:

۱۔ اُبی بن کعب
۲۔ عبد الله بن عباس
۳۔ انس بن مالك
۴۔ مالك بن ابی عامر
۵۔ كثير بن افلج
۶۔ مصعب بن سعد
۷۔ عبد اللّٰه بن فطيمه[4]

اس کمیٹی کی سربراہی اُبی بن کعب کر رہے تھے۔

ابو العالیه کہتے ہیں:

---

[1] ابن اثیر الکامل ۳: ۵۵ [2] سیوطی الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۲۰
[3] تحفة الاحوذی شرح جامع الترمذی [4] التمہید ۱: ۲۸۱

انھم جمعوا القرآن من مصحف ابی بن کعب ، فکان رجال یکتبون یملی علیھم ابی بن کعب۔

انہوں نے قرآن کو ابی بن کعب کے مصحف سے جمع کیا۔ چنانچہ ابی بن کعب املا کراتے تھے اور کچھ لوگ لکھتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اما نحن فَنَقْرَؤُهٗ علی قراء ۃ اُبی۔[1]

ہم بھی ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق (قرآن) پڑھتے ہیں۔

**سرکاری مداخلت:** امت قرآن کو ایک ہی قراءت پر متحد کرنے کی تحریک حضرت حذیفہ کی جانب سے چلی اور اصحاب رسول (ص) نے ان سے اتفاق کیا اوران کی تائید کی۔ حضرت عثمان نے اپنی مرضی کے چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی جو کام نہ کرسکی۔ بعد میں اہل افراد سامنے آئے اورانہوں نے اس عظیم کارنامے کو بطور احسن انجام دیا۔ اس طرح وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ[2] کا الٰہی وعدہ پورا ہوگیا۔

**ایک حرف کا تغیر:** چنانچہ حکومت اس سلسلے میں اس حد تک بے دخل ہوگئی تھی کہ ایک حرف کے تغیر وتبدل پر بھی قادر نہ تھی۔

علباء بن احمد سے روایت ہے:

ان عثمان بن عفان لما اراد ان یکتب المصاحف ارادوا ان یلغوا الواو التی فی براء ۃ وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ ... فقال لھم ابی: لتلحقنھا اولاضعن سیفی علی عاتقی فالحقوھا[4]

حضرت عثمان جب قرآن لکھوا رہے تھے تو سورہ برائت کی آیت وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ کی واوٴ کو حذف کرانا چاہتے تھے مگر اُبی بن کعب[3] نے کہا: یہ واوٴ رہے گی ورنہ ہم تلوار اٹھائیں گے چنانچہ اس واوٴ کو رہنے دیا۔

بعد میں قرآن مجید کے دیگر نسخوں کو نذر آتش کرنے پر لوگوں نے حضرت عثمان کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا تو انہوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے خود کو اس عمل میں دوسروں کا تابع بتایا۔ ملاحظہ ہو ان کا یہ قول:

و انما انا فی ذلك تابع لھؤلاء۔[5]

میں تو اس معاملے میں صرف ان لوگوں کا تابع رہا ہوں۔

**حضرت عثمان جامع قرآن نہیں ہیں:** حارث محاسبی کہتے ہیں:

---

۱؎ وسائل الشیعۃ ۶ : ۱۶۳ ۲؎ ۱۵ حجر : ۹

۳؎ مستشرقین کا یہ اعتراض درست نہیں ہے کہ ابی بن کعب حضرت عمر کے دور میں وفات پا چکے تھے بلکہ تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے تک زندہ تھے اور آرمینیا کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

۴؎ سیوطی در المنثور ۳ : ۴۱۹ ۵؎ تاریخ طبری ۱ : ۲۵۲

المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان و ليس كذلك، انما حمل عثمان الناس على القراءة بوجه واحد۔[1]

لوگوں میں مشہور ہے کہ عثمان جامع قرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ عثمان نے تو لوگوں کو صرف ایک ہی قرائت اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

قاضی ابوبکر اپنی کتاب الانتصار میں لکھتے ہیں:

لم يقصد عثمان قصد ابى بكر فى جمع نفس القرآن بين لوحين، وانما قصد جمعهم على القراءات الثابتة المعروفة عن النبى صلى الله عليه وآله وسلم والغاء ما ليس كذلك، و اخذهم بمصحف لا تقديم فيه و لا تاخير و لا تاويل۔[2]

حضرت عثمان نے حضرت ابوبکر کی طرح قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو ان قرائتوں پر مجتمع کیا جائے جو رسول کریم (ص) سے ثابت ہیں اور جو ثابت نہیں، انہیں متروک کیا جائے اور لوگوں کو ایسے قرآن پر مجتمع کیا جائے جس میں نہ تقدیم و تاخیر ہو اور نہ تاویل۔

حبیب الرحمٰن صدیقی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں فرماتے ہیں:

و ما اشتهر ان جامعه عثمان فهو على ظاهره باطل لانه انما حمل الناس سنة ٣٥ھ القراءة بوجه واحد.[3]

اور یہ جو شہرت ہوئی ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، یہ بات بظاہر باطل ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو ۳۵ ہجری میں لوگوں کو صرف ایک قرائت اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

**حضرت علی علیہ السلام کا موقف:** علامہ حلی اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں:

حضرت عثمان نے حضرت علی (ع) سے بھی منظوری لی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی مشہور ہے جو آپ (ع) نے دور عثمان میں لوگوں کو ایک ہی قرآن پر مجتمع کرنے کے عمل کے انجام پانے کے بعد فرمایا:

لا يهاج القرآن بعد اليوم[4]

آج کے بعد قرآن کبھی مضطرب نہ ہوگا۔

ایک اور مقام پر آپ (ع) نے فرمایا:

ان القرآن لا يهاج اليوم ولا يحول۔[5]

آج قرآن کو قرار آ گیا ہے اور یہ ناقابل تغیر ہو گیا ہے۔

---

[1] السیوطی الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۲۱
[2] حوالہ سابق
[3] مقدمہ تفسیر بیضاوی
[4] طبرسی۔ تفسیر مجمع البیان ۹: ۲۱۸
[5] تمہید ۱: ۲۸۹

حضرت عثمان کے عہد خلافت میں جب لوگوں کو ایک مصحف پر مجتمع کرنے کی مہم چل رہی تھی تو اس وقت جناب طلحہ نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ (ع) نے رسول اللہ(ص) کی وفات کے بعد جو قرآن جمع کیا تھا، جسے اس قوم نے مسترد کر دیا تھا، کیا آج آپ(ع) اس قرآن کو دوبارہ پیش نہیں کر سکتے؟ آپ(ع) نے اس کا جواب نہ دیا۔ طلحہ نے ہر چند اصرار کیا مگر آپ نے جواب نہ دیا۔ آخر طلحہ نے کہا: اے ابوالحسن(ع) آپ مجھے اس بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ آپ (ع) نے فرمایا:

اے طلحہ! میں نے جان بوجھ کر جواب نہیں دیا تھا۔ تم خود بتاؤ کہ لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا یہ قرآن نہیں ہے؟ کیا اس میں غیر قرآن بھی ہے؟ طلحہ نے جواب دیا کہ ہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے یہ سب کا سب ضرور قرآن ہے، تو آپ(ع) نے فرمایا: اگر تم نے اسی قرآن کو لے لیا تو تمہیں آتش جہنم سے نجات مل جائے گی اور جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ طلحہ نے کہا کہ اگر قرآن یہی ہے تو بس کافی ہے۔[1]

## موجودہ قرآن

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جو قرآن اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے، وہ:

۱۔ نہ حضرت علی علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن ہے،

۲۔ نہ عصر ابی بکر میں جمع شدہ قرآن ہے،

۳۔ نہ حضرت عثمان نے کوئی قرآن جمع کیا تھا،

بلکہ اس وقت ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن موجود ہے، وہ عصر رسول (ص) کا تدوین شدہ قرآن ہے جو کہ عصر رسالت (ص) میں ہی امت کے ہاتھوں میں موجود تھا اور عصر رسالت (ص) کے بعد وہی قرآن مختلف نسخوں میں امت کے پاس موجود رہا۔ یہ مختلف نسخے، جس طرح ہمارے زمانے میں چند ایک کمپنیوں کی طرف سے طبع شدہ نسخے رائج ہیں اسی طرح چند ایک اہم نسخے مختلف علاقوں میں رائج ہو گئے۔ چنانچہ:

۱۔ ابی بن کعب کا نسخہ دمشق میں
۲۔ مقداد کا نسخہ حمص میں
۳۔ عبداللہ بن مسعود کا نسخہ کوفہ میں
۴۔ ابوموسیٰ کا نسخہ بصرہ میں رائج تھا۔

ان نسخوں کی قراءتیں بھی قدرے مختلف تھیں جو آگے چل کر وجہ نزاع بن گئیں۔ حضرت حذیفہ رضوان اللہ علیہ کی تحریک پر عصر عثمان میں ان تمام نسخوں کو جمع کیا گیا اور ایک قراءت پر مشتمل ایک نسخہ بنا دیا گیا جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

☆☆☆☆☆

---

[1] کتاب سُلیم بن قیس الھلالی ص ۶۵۷ و بحار الانوار ۳۱: ۴۲۶

# نسخ

نسخ کی تعریف۔ بداء ۔ اقسام نسخ ۔ نسخ تلاوت۔ نسخ حکم۔ تاویل۔ تفسیر اور تاویل میں فرق۔ کیا تاویل قرآن صرف خدا جانتا ہے ۔ نفاذ اور انطباق۔ شان نزول۔ نسخہ ہائے قرآن ۔ طبع قرآن ۔ نقطہ نگاری ۔ اعراب ۔

قرآن انسان سازی کا ایک دستور ہے اور یہ قانون فطرت ہے کہ ارتقا و تکامل دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا قوانین و احکام قرآن میں بھی تدریج و تغیر ضروری تھا۔ خصوصاً اس انقلابی اصلاح کا آغاز جس قوم سے کیا جا رہا تھا وہ جاہلیت و وحشت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چونکہ ایک متوحش اور غیر مہذب قوم کی اصلاح دفعتاً نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے تشریع اسلامی میں نسخ کا ہونا لازمی اور ضروری تھا۔

**النسخ کی تعریف:** شریعت مقدسہ میں ایک ثابت حکم کو دوسرے حکم کے ذریعے اٹھا لینا۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص حکم کو کسی مصلحت کے تحت مقررہ مدت کے لیے نافذ فرماتا ہے، مگر از راہ مصلحت و حکمت اس امر کا اظہار نہیں کرتا کہ یہ حکم ایک خاص معینہ مدت کے لیے محدود ہے۔ بعد میں نسخ کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ اس حکم کی مدت ختم ہوگئی ہے۔

لہٰذا نسخ میں صرف ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے سے یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ حکم صرف ایک خاص مدت کے لیے محدود ہے اور اس نہ بتانے میں بہت سے مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اس نہ بتانے کی وجہ سے اس حکم کے دائمی ہونے کا جو تصور لوگوں کے ذہن میں قائم ہوتا ہے، حقیقت میں اس تصور کا نسخ ہے، نہ کہ حکم واقعی کا نسخ۔ پس نسخ کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کا نظریہ بدل گیا ہے۔

**بداء:** جیسا کہ نسخ میں بیان کیا گیا ہے کہ حکم شرعی پہلے ہی سے اللہ کے نزدیک ایک خاص وقت کے لیے مخصوص تھا، لیکن کسی مصلحت کی بنیاد پر اس کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ بعد میں نسخ کے ذریعے اظہار ہوا تو لوگوں کے تصور کے مطابق سابقہ حکم اٹھا لیا گیا۔ بالکل اسی طرح بداء بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ پہلے سے طے ہوتا ہے، لیکن اس فیصلے کا اظہار نہیں کیا جاتا تو لوگوں کے اذہان میں یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ پہلے سے طے شدہ فیصلے کا اظہار فرماتا ہے تو لوگوں کو بداء یعنی تبدیلی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا بداء کسی امر کے بارے میں لوگوں کے تصور کی تبدیلی ہے، نہ کہ واقعی حکم اور فیصلے کی تبدیلی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ما بدا للّٰہ فی شیء الا کان فی علمہ قبل ان یبدو لہ۔[1]

اللہ کو کسی شے کے بارے میں بداء نہیں ہوتا مگر یہ کہ اللہ کو اس کا پہلے سے علم ہوتا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۱: ۱۴۸ باب البداء

پس بداء کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ کا نظریہ بدل گیا ہے۔ بداء اور نسخ میں فرق صرف یہ ہے کہ نسخ تشریعی امور میں ہوتا ہے اور بداء تکوینی امور میں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ○ [1]

اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

عقیدۂ بداء سے اللہ تعالیٰ کی طرف جہالت کی نسبت لازم نہیں آتی بلکہ بداء کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جیسے چاہتا ہے کائنات میں تصرف کرتا ہے۔

یہ یہود کا عقیدہ ہے کہ اللہ بے بس ہے۔ روز ازل اس نے جو فیصلہ کر دیا اسے نہ بدل سکتا ہے نہ اس میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ یعنی قضا و قدر کے ذریعے روز ازل جو فیصلہ کر دیا ہے، اس فیصلے کے خلاف اور کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہود کے اس باطل نظریے کو قرآن نے رد کیا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ ... [2]

اور یہود کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، خود ان کے ہاتھ باندھے جائیں اور ان پر لعنت ہو اس (گستاخانہ) بات پر بلکہ اللہ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

عقیدہ بداء سے ہی انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہی عطا و بخشش والا ہے۔ انسان دست سوال دراز کرتا ہے کہ وہ کریم ہے اور پھر اپنی پوری زندگی میں ذات الٰہی سے وابستگی اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک پر امید زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر عقیدہ بداء نہ ہو اور انسان یہ سمجھے کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہی ہو کر رہے گا اور انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے تو وہ یاس و ناامیدی میں مبتلا رہے گا اور پھر اللہ کی بارگاہ میں تضرع اور انکساری کے ساتھ رجوع نہیں کرے گا۔ اسی طرح دعا و صدقات کا فلسفہ بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

عقیدہ بداء سے علم خدا اور علم بشر کا فرق بھی سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے لیکن بشر کو معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ کی مشیت کیا ہے۔ اس لیے بندہ ہمیشہ مشیت الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کے معصوم (ع) سے روایت ہے:

ما عبد اللّٰه بشیء مثل البداء۔ [3]

اللہ کی پرستش کے لیے بداء سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ لفظ بداء صحیح بخاری میں بھی وارد ہوا ہے۔ ابو ہریرہ راوی ہے:

سمع رسول اللّٰه یقول: ان ثلاثة فی

انہوں نے رسول کریم (ص) کو فرماتے سنا کہ بنی

---

[1] ۱۳/ رعد: ۳۹ [2] ۵/ مائدہ: ۶۴ [3] اصول الکافی باب البداء ۱: ۱۴۶

بنی اسرائیل ابرص و اقرع و اعمی بـدا لـلّٰه ان یبتلیهم فبعث الله الیهم ملکاً۔[1]

اسرائیل میں تین شخص ایسے تھے جن میں ایک مبروص، دوسرا اندھا اور تیسرا کوڑھی تھا۔ اللہ تعالیٰ کو بداء ہوا کہ ان کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ اس نے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔

صحیح ترمذی، سنن ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں ہے:

قـال رسـول الـله:لا یرد القضاء الا الدعاء و لا یزید فی العمر الا البر۔

رسول اللہ(ص) نے ارشادفرمایا کہ قضائے الٰہی کو صرف دعا روک سکتی ہے اور نیکی ہی سے عمر دراز ہوتی ہے۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خوئی اعلی اللہ مقامہ بداء کی تشریح وتوضیح کے بعد فرماتے ہیں:

و انهم نسبوا الی الشیعة ماهم براءٌ مـنـه ، وانهـم لم یحسنوا فی الفهم ولـم یـحسـنـوا فـی النقد ، ولیتهم اذلـم یـعـرفـوا تثبتوا او توقفوا کما تـفـرضـه الامـانة فـی النقل و کما تـقـتـضـیـه الـحـیـطة فـی الحکم و الورع فی الدین۔[2]

انہوں نے شیعوں کی طرف اس چیز کی نسبت دی ہے جس سے وہ بری الذمہ ہیں۔ انہوں نے نہ تو درست سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی تنقید کا صحیح اصول اپنایا۔ کاش مطلب واضح نہ ہو سکنے پر یہ لوگ تحقیق سے کام لیتے یا کچھ توقف کرتے (تا کہ حق ان پر واضح ہوجائے)، پھر کسی کا عقیدہ ونظریہ بیان کرنے میں امانت فی النقل کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ فیصلے کرنے سے پہلے آ گاہی حاصل کرنا اور تقویٰ اختیار کرنا چاہیے (مگر ان لوگوں نے بہتان طرازی میں جلد بازی سے کام لیا)۔

**اقسام نسخ:** علمائے اہل سنت نے نسخ قرآن کی چنداقسام بیان کی ہیں۔ ذیل میں ہم ان اقسام کا ذکر کریں گے اور ساتھ امامیہ کا نقطۂ نظر بھی بیان کریں گے۔

**۱۔ نسـخ الـحـکـم و التلاوة :** یعنی قرآن کی آیت کو بھی اٹھا لیا گیا اور حکم کو بھی۔ بایں معنی کہ بعض آیات قرآن کا حصہ تھیں اور مسلمان ان آیات کو بطور قرآن تلاوت کیا کرتے تھے نیز ان میں ایک شرعی حکم بھی موجود تھا لیکن بعد میں ان آیات کو قرآن سے حذف کر دیا گیا اور حکم بھی منسوخ ہو گیا۔

علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

امـا نسـخ الحکم و التلاوة جمیعاً فـقـد اجـمع علیه القائلون بالنسخ من المسلمین۔[3]

جہاں تک حکم وتلاوت کے نسخ کا مسئلہ ہے تو مسلمانوں میں سے جو لوگ نسخ کے قائل ہیں ان سب نے اس مسئلے میں اجماع کیا ہے۔



---

۱؎ صحیح بخاری ۲: ۳۶۱ طبع دار الاشاعت کراچی
۲؎ البیان فی تفسیر القرآن امام الخوئی، ص ۳۸۳
۳؎ زرقانی، مناهل العرفان فی علوم القرآن ۲: ۱۱۱

امامیہ کے نزدیک اس قسم کا نسخ باطل ہے اور کتاب خدا اس سے بالاتر ہے کہ اس کی بعض آیات کو قرآن کا حصہ قرار دینے کے بعد حذف کر دیا جائے یا اٹھا لیا جائے ۔ امامیہ کے نزدیک صرف وہ آیات قرآن کا حصہ ہیں جو تواتر سے ثابت ہوں۔

علمائے اہل سنت اس قسم کی کچھ آیات کو بھی قرآن کا حصہ مانتے ہیں جو غیر متواتر احاد روایات کے ذریعے منقول ہیں۔ پھر ان آیات کو موجودہ قرآن میں نہیں پاتے تو نسخ تلاوت کا نظریہ قائم کرتے ہیں اور یہ نظریہ اس لیے قائم کرتے ہیں کہ یہ روایتیں کتب صحاح میں موجود ہیں جنہیں قبول کرنا اہل سنت نے اپنے مذہب میں لازمی قرار دے رکھا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم اور صحیح ابن حبان میں یہ روایت درج ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا:

كان فيما انزل من القرآن "عشر رضعات معلومات يحرمن" ثم نسخن بخمس معلومات فتوفى رسول الله و هن فيما يقرأ من القرآن ۔[1]

قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی تھی کہ" واضح طور پر دس مرتبہ دودھ پلانے والیاں حرام ہو جاتی ہیں" پھر یہ آیت پانچ مرتبہ دودھ پلانے کے حکم سے منسوخ ہو گئی، حالانکہ رسول کریم (ص) کی وفات کے وقت تک یہ آیات قرآن میں تلاوت کی جاتی تھیں ۔

اس روایت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت رسول خدا (ص) کی وفات تک قرآن میں موجود تھی اور آپ (ص) کی وفات کے بعد ہی قرآن سے حذف کر دی گئی اور بقول ان حضرات کے ایسا حضرت ابوبکر کے زمانے میں ہوا جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی مقدمۂ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں:

نعم اسقط زمن الصديق مالم يتواتر و نسخت تلاوته۔[2]

ہاں حضرت صدیق کے زمانے میں ان آیات کو حذف کر دیا گیا جو غیر متواتر تھیں اور ان کی تلاوت بھی منسوخ کر دی گئی۔

قابل توجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: القرآن الف الف حرف (الاتقان) قرآن دس لاکھ حروف پر مشتمل ہے۔ جب کہ قرآن مجید کے کل حروف تین لاکھ تئیس ہزار چھ سو اکہتر (۳۲۳۶۷۱) ہیں۔ بنا بر ایں موجودہ قرآن سے چھ لاکھ چھہتر ہزار تین سو انتیس (۶۷۶۳۲۹) حروف غائب ہیں۔

حق تو یہ تھا کہ اس روایت کو حرمت قرآن کے منافی اور قرآنی مسلمات کے خلاف قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا مگر مقام افسوس ہے کہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں بڑی صراحت اور جسارت کے ساتھ لکھ دیا:

---

[1] صحیح مسلم ۲: ۱۰۷۵۔ صحیح ابن حبان ۱۰: ۳۶ [2] ماخوذ از روح المعانی

قد حمل ذلك على ما نسخ رسمه من القرآن ایضاً اذا لموجود لا یبلغ هذا الحد۔

اس روایت کو اس بات پر محمول کیا گیا ہے کہ یہ حصہ قرآن سے منسوخ الرسم ہو گیا ہے کیونکہ موجودہ قرآن میں اس مقدار کے حروف موجود نہیں ہیں۔

کس قدر مقام حیرت ہے کہ قرآن قرآن کا دو تہائی منسوخ الرسم ہو جائے اور صرف ایک تہائی باقی رہ جائے۔

مقام تعجب ہے کہ نسخ تلاوت پر قطعاً کوئی دلیل نہیں ہے۔ جس بات کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ علمی حلقوں میں مضحکہ ہے۔ کہتے ہیں: آیت رجم صحیح بخاری میں مذکور ہونے کی وجہ سے قرآن کا حصہ ہے۔ آیت رجم چونکہ موجودہ قرآن میں نہیں ہے لہٰذا نسخ تلاوت کے ذریعے اس آیت کو اٹھا لیا گیا۔

تعجب یہ ہے کہ اول خبر واحد سے قرآن ثابت نہیں ہوتا ثانیاً قرآن کا ناسخ قرآن ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خبر واحد متواتر سے قرآن کے منسوخ ہونا واقع ہونے کا کوئی قائل نہیں ہے۔ نسخ تلاوت صرف ایک مفروضہ ہے جس کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جدید محققین نسخ تلاوت کو مسترد کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ محمد صدیق الغماری نے نسخ تلاوت کی رد میں ایک مستقل کتاب بنام ذوق الحلاوۃ ببیان امتناع نسخ التلاوۃ لکھی ہے۔

شیعہ امامیہ کے نزدیک یہ قرآن کی عظمت کے خلاف بڑی جسارت ہے اور اس نظریے سے تحریف قرآن لازم آتی ہے کہ عصر رسالت (ص) کے بعد قرآن کا کچھ حصہ اس میں سے حذف کر دیا گیا۔

شیعہ امامیہ کے نزدیک قرآن عصر رسالت (ص) میں مدون تھا اور ہر سال قرآن کی بازخوانی ہوتی تھی اور رسول خداؐ کی وفات کے بعد کوئی آیت حذف نہیں کی گئی جب کہ یہ خدا کا وعدہ بھی ہے کہ قرآن کے ساتھ کوئی دست درازی نہیں ہوسکتی۔

صرف امامیہ ہی نہیں بلکہ خود اہل سنت کے ایک معتدبہ گروہ نے بھی اس نظریے کو یہ کہکر رد کر دیا ہے کہ یہ عظمت قرآن کے منافی ہے اور اس سے تحریف قرآن ثابت ہوتی ہے۔

**۲۔ نسخ تلاوت:** یعنی قرآن سے ایک آیت کو اٹھا لیا جائے مگر حکم باقی رکھا جائے۔ اس قسم کے نسخ کو بھی علمائے شیعہ نے اجماعی طور پر مسترد کیا ہے۔ علمائے شیعہ کا نظریہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قرآن صرف تواتر کے ذریعے ہی ثابت ہوسکتا ہے۔ خبر واحد سے چونکہ قرآن ثابت ہی نہیں ہوتا، اس لیے نسخ بھی قرآن کے ثبوت پر موقوف ہونے کی وجہ سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ کسی آیت کو قرآن کا حصہ تسلیم کرلینے کے بعد خبرواحد کے ذریعے اس کے منسوخ ہونے کا نظریہ عیناً تحریف قرآن کا نظریہ ہے۔

مگر مقام حیرت ہے کہ تقریباً تمام علمائے اہل سنت نے اتفاق کیا ہے کہ نسخ تلاوت واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آمدی متوفی ۶۳۱ھ لکھتے ہیں:

اتفق العلماء علی جواز نسخ التلاوۃ دون الحکم۔[1]

تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حکم کے بغیر صرف تلاوت منسوخ ہوسکتی ہے۔

اس قسم کے نسخ کے لیے وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن کا ذکر تحریف قرآن کے مسئلے میں تفصیل سے ہوا ہے۔ مثلا آیہ رجم اور یہ کہ سورہ احزاب، سورہ بقرہ کے برابر تھی وغیرہ۔[2]

حالانکہ کسی آیت کا منسوخ یا غیر منسوخ ہونا تو بعد کی بات ہے، پہلے تو اس کا جزو قرآن ہونا ثابت ہونا چاہیے اور وہ بھی تواتر سے، خبر واحد کے ذریعے نہیں، خواہ وہ واحد روایت کتنی ہی صحیح السند کیوں نہ ہو۔ پھر اگر آیت جزو قرآن ثابت ہو جائے تو اسے منسوخ قرار دینے کے لیے بھی خبر واحد کافی نہیں، یہ بھی تواتر سے ہونی چاہیے۔

لیکن مقام تعجب ہے کہ غیر امامیہ کے وہ محققین بھی جو نسخ کی پہلی قسم کو مسترد کرتے ہیں، اس قسم کے نسخ کے قائل ہیں، حالانکہ ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ان دونوں کے تسلیم کرنے سے تحریف قرآن لازم آتی ہے۔

اور اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کچھ آیات کو جزو قرآن تسلیم کر کے تلاوت منسوخ کرنا عیناً تحریف قرآن کا نظریہ قرار پاتا ہے۔ اس لیے اہل سنت کے کچھ دانشور اس نظریے کو تقدس قرآن کے خلاف تصور کرتے ہوئے اسے مسترد کرتے ہیں۔[3]

**۳۔ نسخ حکم:** یعنی آیت برقرار رہے اور اس کا حکم منسوخ ہو جائے تو اسے نسخ حکم کہتے ہیں۔ اس قسم کے نسخ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ بس ایسا ہی نسخ قرآن مجید میں واقع ہوا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا کہ جب کوئی شخص رسول خدا (ص) سے تخلیہ میں سرگوشی کرنا چاہے تو پہلے صدقہ دے۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ... [4]

اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک دینار کے دس درہم لیے۔ ایک ایک درہم صدقہ فرماتے اور رسول کریم (ص) سے سرگوشی کرتے۔ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص نے صدقہ دے کر اس آیت پر عمل نہیں کیا۔[5]

اس حکم کے بعد لوگوں کی سرگوشیاں رک گئیں اور کسی نے اس آیت پر عمل نہ کیا سوائے علی علیہ السلام کے۔ آخر کچھ عرصے بعد درج ذیل آیت کے ذریعے صدقہ دینے کا حکم منسوخ ہو گیا اور ساتھ سرزنش بھی ہوئی:

---

۱۔ الاحکام للآمدی فی اصول الاحکام ۳: ۱۵۴ ۲۔ زرقانی ۔ مناھل العرفان فی علوم القرآن
۳۔ صبحی صالح۔ مباحث فی علوم القرآن ص ۲۶۵ ۴۔ ۵۸ مجادلۃ: ۱۲ ۵۔ طبری، تفسیر ۲۸ : ۱۵ و فتح القدیر ۵: ۱۸۶

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ...۔[1]

کیا تم اپنی سرگوشیوں سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے ہو؟ اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تو تم نماز قائم کرو....

قرآن مجید میں متعدد احکام ایسے ہیں جنہیں دوسری قرآنی آیات کے ذریعے منسوخ کیا گیا ہے۔ ناسخ و منسوخ کا جاننا علم القرآن کا اہم ترین باب ہے۔ ہمارے علماء نے اسی موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔

سب سے پہلے اس موضوع پر ابو محمد عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن الاصم المسمعی نے رسالة الناسخ و المنسوخ کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ آپ حضرت امام جعفر صادق (ع) کے شاگرد تھے۔

**تاویل:** اس کا مشہور مفہوم تو یہ ہے کہ ظاہر کلام سے جو مطلب اذہان میں آتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور دقیق مطلب مراد لیا جائے جو عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو۔ مثلاً اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ [2] ''کیا وہ زمین میں سیر نہیں کرتے'' کا مطلب یہ لیا جائے۔ اولم ینظروا الی القرآن'' کیا وہ قرآن کو نہیں دیکھتے؟'' وغیرہ۔

تاویل کی یہ تشریح اہل تحقیق کے نزدیک ہرگز درست نہیں ہے، بلکہ تاویل کا مطلب ہے کہ ہر حکم اور عمل کا منطقی محور، جس پر قرآنی احکام وقوانین کا دار و مدار ہوتا ہے۔

جیسے ارشاد الٰہی ہے:

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝[3]

اور تم ناپتے وقت پیمانے کو پورا کر کے دو اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھو، بھلائی اسی میں ہے اور انجام بھی اسی کا زیادہ بہتر ہے۔

ایک اور مقام پر کچھ اس سے زیادہ واضح طور پر تاویل کا معنی سامنے آتا ہے:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ ...۔[4]

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے احاطہ علم میں نہیں آئی اور ابھی اس کا انجام بھی ان کے سامنے نہیں کھلا۔

تاویل کی مزید وضاحت حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعے سے ہو جاتی ہے کہ جب حضرت خضر (ع) نے کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک بچے کو قتل کیا اور ایک افتادہ دیوار کو درست کرنا شروع کیا تو حضرت موسیٰ (ع) سے ضبط نہ ہو سکا کیونکہ حضرت موسیٰ (ع) ان اقدامات کے مرکزی نکتے اور ان میں پوشیدہ

---

[1] ۵۸ مجادلة: ۱۳ [2] ۳۰ روم: ۹ [3] ۱۷ اسراء: ۳۵ [4] ۱۰ یونس: ۳۹

اسرار و حکمت سے آگاہ نہ تھے۔ چنانچہ ان اقدامات میں پوشیدہ اسرار اور حکمتوں کے بیان کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝ ...[1] یہ ہے ان باتوں کی تاویل جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

مندرجہ بالا اور دیگر قرآنی استعمالات کے مطابق تاویل کا مطلب نہ ظاہری معنی ہے اور نہ باطنی معنی بلکہ تاویل کا مطلب اللہ کے احکام کے اندر پوشیدہ وہ حکمتیں اور اسرار ہیں جن کا علم صرف اللہ کے پاس ہے یا ان بندگانِ خاص کے پاس ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خزانۂ غیب کے علوم سے نوازا ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ...[2] اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ خوئی قدس سرہ فرماتے ہیں:

و قد يستعمل التاويل و يراد منه العاقبة وما يؤول اليه الامر و على ذلك جرت الآية الكريمة۔[3] تاویل سے کبھی انجام اور کسی امر کی بازگشت مراد لی جاتی ہے اور آیۂ شریفہ بھی اس معنی کے مطابق ہے۔

**تفسیر اور تاویل میں فرق:** کسی آیت میں مقصود الٰہی کی وضاحت کو تفسیر کہتے ہیں[4] اور کسی حکم یا عمل کے مرکزی نکتے اور حکمت کو تاویل کہتے ہیں

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

ظهره تنزيله و بطنه تاويله ۔[5] قرآن کا ظاہری معنی تنزیل اور باطنی معنی تاویل ہے.

**کیا تاویل قرآن صرف خدا جانتا ہے؟:** اہل سنت کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ تاویل قرآن صرف خدا جانتا ہے۔ جب کہ شیعہ امامیہ اور بعض علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ ان کے نزدیک قرآن یا اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے لیے قابل استفادہ نہ ہو۔ قرآن تو انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تدبر اور غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ اگر قرآن کا کچھ حصہ نا قابل فہم ہے تو نہ تو یہ ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے اور نہ ہی اس میں غور و فکر کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔ کوئی کبھی بھی ایسا کلام نہیں کرتا جس کا مطلب خود اس کے علاوہ دوسرا کوئی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تو مقصد کلام ہی ختم ہو جاتا ہے۔

آیہ کریمہ:

---

[1] ۱۸ کہف: ۸۲ [2] ۳ آل عمران: ۷ [3] البیان، امام الخوئی ص ۲۲۳
[4] البیان فی تفسیر القرآن ۔ الامام الخوئی ۔ اردو ترجمہ ص ۳۹۵ [5] وسائل الشیعۃ ۲۷: ۱۹۶

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ...[1]

اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں جو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

میں وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کوئی نیا جملہ نہیں ہے بلکہ سابقہ جملے پر عطف ہوا ہے اور آیت کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اس کی تاویل اللہ اور راسخون فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جملہ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا جملہ مستانفہ حالیہ ہے۔

اس مفہوم کو تفسیر و ادب عربی کے بہت سے ماہرین نے ادبی شواہد اور قرآنی سیاق و سباق کی روشنی میں اخذ کیا ہے۔[2]

کیونکہ راسخون فی العلم، علمِ تاویل کے ساتھ ہی مربوط ہوسکتا ہے۔ آمنا کے لیے رسوخ فی العلم کی ضرورت نہیں ہے۔ مزید برآں ایمان والوں سے تو یہ بھی کہا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا ... [3] اے ایمان والو! سچا ایمان لے آؤ۔

یعنی ایمان میں پختگی نہیں ہے اس لیے نئے سرے سے ایمان لانے کی ضرورت ہے۔

اللہ کی ذات وہ ہے جس نے بہترین کلام کو کتاب متشابہ کی صورت میں نازل فرمایا۔

لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے شیریں اسلوب اور اس کے اعجازِ الٰہی ہونے میں ساری آیات باہم مشابہت و مماثلت رکھتی ہیں۔ غیر خدا کا کلام یعنی ادیبوں کے اشعار اور مقالات و خطبات جہاں فصاحت و بلاغت کے شاہکار ہوتے ہیں وہاں ان میں کمزور پہلو اور سرقت شعری و فکری کا عنصر ضرور دکھائی دیتا ہے، مگر قرآن میں اس قسم کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ یہ اول سے لے کر آخر تک معجزہ ہے اور اس کے اعجاز میں کہیں فرق نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ یہ ایک ہی مطلب متعدد مقامات پر پیش کرتے وقت مختلف اسلوبِ کلام اختیار کرتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرا اسلوب پہلے سے یا پہلا دوسرے سے کمتر ہے۔ دونوں اسلوب معجزہ اور دونوں فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس اعتبار سے پورا قرآن باہم متشابہ ہے۔

دوسری طرف کچھ آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن محکم ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ .... [4] یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات مستحکم کی گئی ہیں۔

لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ آیات کا مجموعہ یعنی قرآن ایک ناقابل خلل دستور ہے اور اس کے قوانین محکم اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں۔ اس کے افکار کی پختگی، قوانین کے باہمی ارتباط اور نظام کی ہم آہنگی میں کوئی خلل نہیں ہے۔

بعض آیات قرآنی یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کی آیات دو قسم کی ہیں: کچھ محکم اور کچھ متشابہ۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

---

[1] ۳ آل عمران: ۷ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر المنار ۳: ۱۶۷۔ تاویل مشکل القرآن وغیرہ [3] ۴ نساء: ۱۳۶ [4] ۱۱ ھود: ۱

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ....[1]

وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں، وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔

اس بات میں شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ قرآن میں چند متشابہ آیات موجود ہیں اور ایسی آیات بہت کم ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن میں متشابہ آیات نہیں ہیں کیونکہ اگر اس میں متشابہ آیات ہوتیں تو لوگ انہیں نہ سمجھ سکتے۔ اس طرح قرآن سب لوگوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت نہیں بن سکتا تھا، جب کہ خود قرآن کہتا ہے:

هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًی وَّ مَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ○[2]

یہ (عام) لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

جبکہ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن پورے کا پورا متشابہ ہے اور سب کے لیے قابل فہم نہیں ہے۔

یہ دونوں نظریے ناقابل قبول ہیں۔ کیونکہ قرآن میں متشابہ آیات کا موجود ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ قرآن ہدایت کا سرچشمہ ہے، کیونکہ قرآن میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جو کسی طرح بھی قابل فہم نہ ہو۔ متشابہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ دوسرے ذرائع کی مدد سے بھی ناقابل فہم ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آیت از خود قابل فہم نہیں ہے بلکہ دیگر آیات و احادیث کے ذریعے قابل فہم ہے۔[3]

دوسرا نظریہ اس لیے بھی قابل قبول نہیں کہ قرآن نے خود فرمایا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ....[4]

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔

اگر قرآن ہمارے لیے ناقابل فہم ہے تو پھر ہم تدبر فی القرآن کیسے کر سکتے ہیں۔

**نفاذ اور انطباق:** چونکہ قرآن مجید بنی نوع انسان کے لیے ایک ابدی دستور ہے۔ لہٰذا جس طرح دور نزول میں جس امر پر منطبق ہوتا تھا، اسی طرح آئندہ آنے والے اس قسم کے تمام امور پر بھی نافذ و منطبق ہوگا۔ بشرطیکہ زمانۂ نزول کے تمام حالات و شرائط اس امر میں موجود ہوں۔

لہٰذا جو فرائض زمانۂ نزول کے لوگوں پر عائد ہوتے تھے، وہی فرائض آنے والے لوگوں پر بھی عائد ہوں گے۔ زمانۂ نزول وحی میں کسی شخص کی مدح ہوتی ہے تو اس قسم کے اوصاف رکھنے والے تمام افراد پر یہ مدح منطبق ہوگی اور اگر زمانۂ نزول میں کسی کی مذمت ہوئی ہے تو آئندہ بھی اس قسم کے اوصاف رذیلہ رکھنے والوں پر اس مذمت کا حکم جاری ہوگا۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۷ [2] ۳ آل عمران: ۱۳۸ [3] مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر آیہ ۷ سورہ آل عمران [4] ۴ نساء ۸۲

پس شان نزول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آیت صرف شان نزول پر ہی منحصر و منجمد ہوگئی ہے۔ اس بات کو مفسرین یوں بیان کرتے ہیں: العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ لفظ کی عمومیت دیکھی جاتی ہے خواہ سبب خاص کیوں نہ ہو۔

اسی مفہوم کو احادیث معصومین (ع) میں جَـری (نفاذ) وانطباق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

ولو ان الآیة نزلت فی قوم ثم مات اولئك ماتت الآیة لما بقی من القرآن شیء، ولکن القرآن یجری اوله علی آخره ما دامت السمٰوٰت والارض۔[1]

اور اگر کسی قوم و جماعت کے بارے میں ایک آیت نازل ہوتی اور پھر ان لوگوں کے مر جانے پر آیت کی افادیت بھی ختم ہو جاتی تو اس طرح تو قرآن ختم ہو کر رہ جاتا، حالانکہ جب تک آسمان و زمین باقی ہیں، قرآن بھی اول و آخر جاری و نافذ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے درج ذیل آیت کے بارے میں پوچھا گیا:

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ ....[2]

اور اللہ نے جن رشتوں کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں قائم رکھتے ہیں۔

تو آپ (ع) نے فرمایا:

هذه نزلت فی رحم آل محمد صلی الله علیه و آله وسلم وقد تکون فی قرابتك فلا تکونن ممن یقول للشیء انه فی شیء واحد۔[3]

یہ آیت آل محمدؐ کے صلۂ رحم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ تیرے اقربا کے بارے میں بھی ہوسکتی ہے۔ تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جو کہتے ہیں کہ یہ ایک ہی شے میں منحصر ہے۔

**شان نزول:** قرآن مجید کی آیات مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے نازل ہوئی ہیں۔ کچھ آیات کسی سوال کے جواب میں اور کچھ بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے نازل ہوئیں۔ کچھ کسی اہم واقعے کے سلسلے میں اور کچھ کسی شخصیت یا اشخاص کی مدح یا قدح میں نازل ہوئیں۔ لیکن کچھ آیات ایسی بھی ہیں جو صرف بیان احکام کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

قرآن فہمی کے لیے شان نزول کا علم ضروری ہے۔ اگر کسی کلام کے صادر ہونے کے موقعے اور مناسبت کا علم ہو تو اس کلام کے حقیقی مفہوم کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور اگر کسی کلام کے محل نزول کا علم نہ ہو تو اس کا رخ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے میں روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سب سے زیادہ

---

[1] البیان فی تفسیر القرآن امام الخوئی، ص ۲۳ [2] ۱۳ رعد: ۲۱ [3] البیان فی تفسیر القرآن۔ امام الخوئی، ص ۲۳

رموز قرآن سے واقف ہیں۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

ما نزلت فی القران ایة الا و قد علمت این نزلت و فیمن نزلت و فی ای شیٔ نزلت و فی سهل نزلت ام فی جبل نزلت۔[1]

قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہاں نازل ہوئی، کس کے بارے میں نازل ہوئی، کس چیز کے بارے میں نازل ہوئی، میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر نازل ہوئی۔

روایت ہے کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

سلونی فو اللّٰه لا تسئلونی عن شیء الا اخبرتکم، و سلونی عن کتاب الله فوالله ما من آیة الا و انا اعلم ابلیل نزلت ام بنهار ام فی سهل ام فی جبل۔[2]

مجھ سے پوچھ لو۔ قسم بخدا تم جس چیز کے بارے میں بھی پوچھو گے میں تمہیں بتاؤں گا اور مجھ سے قرآن کے بارے میں پوچھو۔ بخدا کوئی ایسی آیت نہیں مگر یہ کہ میں اسے جانتا ہوں کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن میں، میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

حضرت علی علیہ السلام نے علم قرآن کو زمان و مکانِ نزول کے ساتھ مربوط فرمایا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فہم قرآن اس کے بغیر مشکل ہے۔ کیونکہ جس محل و موقعے پر کلام نازل ہوا ہے، اس کا کلام کے مفہوم کے ساتھ ربط ہوتا ہے۔ مزید برآں کلام فہمی میں مخاطَب یا مخاطَبین کے نظریے اور خیالات کا بھی دخل ہوتا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیت ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ...[3]

صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کا چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں۔

شان نزول سے ہٹ کر آیت کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے تو مفہوم یہ معلوم ہوتا کہ صفا اور مروہ کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یعنی ممنوع نہیں، جائز کام ہے۔ اس کلام سے ہرگز یہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا کہ صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنا واجب اور حج و عمرے کا جزو اور حصہ ہے۔ جب کہ اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر زمانۂ جاہلیت میں مشرکوں کے دیوتاؤں کی مورتیاں نصب تھیں اور وہ ان پہاڑیوں میں دوڑ لگاتے اور ان بتوں کو چومتے تھے۔ صدر اول کے مسلمانوں کو یہ خیال گزرا کہ کہیں صفا و مروہ کے درمیان سعی مشرکین کے شعائر میں سے تو نہیں؟ جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

صفا اور مروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کا چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں۔

لہٰذا شان نزول معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس طرز خطاب سے صحیح مفہوم کا اخذ کرنا دشوار ہوتا

---

[1] بحار الانوار ۸۹: ۷۹ [2] سعد السعود ص ۲۸۴۔ شواهد التنزیل ۱: ۴۱۔ کچھ فرق کے ساتھ۔ صحیح مسلم [3] ۲ بقرة: ۱۵۸

ہے۔مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ سب قرآنی آیات کے لیے شان نزول کا ہونا ضروری ہو، بلکہ قرآن مجید کا اکثر و بیشتر حصہ ایسا ہے جو کسی واقعے یا حادثے کے سلسلے میں نہیں بلکہ قرآن از خود احکام و قصصِ انبیاء بیان کرتا ہے۔

شان نزول کے سلسلے میں ایک اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ قرآنی آیات کی شان نزول کے بارے میں روایات نہایت متضاد ہیں۔ خاص کر اسرائیلیات پر مبنی روایات کی کثرت کی وجہ سے اکثر روایات ناقابل اعتنا ہیں ۔ مفسر اور محقق کے لیے ایسے مقام پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ دیکھے کہ کون سی روایت سیاق و سباق آیت کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

**نسخہ ہائے قرآن:** آسمانی کتب میں سے کسی کتاب کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو قرآن مجید کو حاصل ہوا ہے۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں مسلمانوں نے اپنی تمام تر توجہات قرآن مجید پر مبذول رکھیں۔ چنانچہ اسلامی ممالک کے مختلف شہروں میں ہزاروں مساجد، مکاتب، مدارس، کتب خانے، اور اسلامی مراکز میں اس مقدس کتاب کے ہزاروں قلمی نسخے پائے جاتے ہیں اور اب جب کہ طباعت کے آسان طریقے ایجاد ہو گئے ہیں اور اس کے لاکھوں نسخے طبع ہو رہے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے ابھی تک ہاتھ سے کتابت قرآن کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

**قرآن کی طباعت:** قرآن کا پہلا ایڈیشن سب سے پہلے ۱۵۳۰ء میں اٹلی کے شہر وینس (Venice) میں طبع ہوا، لیکن چرچ کی طرف سے تمام قرآنی نسخے ضبط ہوگئے اور اس کی طباعت پر پابندی عائد ہوگئی ۔ اس کے باجود اس ایڈیشن کا ایک نسخہ ابھی تک وینس کی ایک لائبریری میں محفوظ ہے۔[1]

پھر ۱۶۹۴ء میں جرمنی کے شہر ہمبرگ (Humberg) میں قرآن کا ایک ایڈیشن طبع ہوا۔ اس کے کچھ نسخے دار الکتب العربیہ مصر میں اب تک محفوظ ہیں۔

پھر ۱۷۶۸ء میں جرمنی میں اس کی طباعت ہوئی۔

اس کے بعد ۱۷۹۷ء میں روس کے مسلمانوں نے قرآن کی طباعت کی۔

یورپ میں طبع شدہ قرآنی نسخوں کو مسلمانوں میں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، چنانچہ مسلمانوں نے اپنے قلمی نسخوں ہی سے تلاوت جاری رکھی۔ اس طرح مسلمانوں نے غیروں کی ہر ممکنہ سازش کو ناکام بنا دیا۔

عالم اسلام میں سب سے پہلے ایران میں ۱۲۳۲ھ بمطابق ۱۸۱۷ء میں تبریز میں ایک طبع خانہ قائم کیا گیا جس میں ۱۲۴۳ھ بمطابق ۱۸۲۸ء میں قرآن طبع کیا گیا۔[2]

اس کے بعد ۱۲۶۶ھ میں کلکتہ میں اور بعد ازاں ہندوستان کے متعدد دوسرے شہروں میں قرآن مجید طبع ہونا شروع ہو گیا۔

**نقطہ نگاری:** شروع میں قرآن مجید کی کتابت نقطوں کے بغیر ہوتی تھی۔ با، تا ،ثا اور یا میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ج، ح اور خ میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

---

[1] روزنامہ جنگ ۶ مارچ ۱۹۸۹ء [2] الخط العربی الاسلامی ص ۱۲۳ بحوالہ التمہید ۱: ۳۵۷

اس لیے صدر اسلام میں قرائت قرآن کے لیے صرف نسخہ ہائے قرآن ہی کافی نہ تھے بلکہ استادوں سے سینہ بہ سینہ حفظ کرنا بھی ضروری تھا۔ مثلاً نبلو کو بے نقطہ ہونے کی وجہ سے چھ طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا:

نَبلو، تَبلو، یَبلو، نَتلو، تَتلو، یَتلو اور اسی طرح نعلم کو بے نقطہ ہونے کی وجہ سے یَعلم، تَعلم اور نَعلم تین طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔

اسی وجہ سے قرأتوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ مثلاً بعض نے سورۂ آل عمران کی ۴۸ ویں آیت میں یعلمه پڑھا اور بعض نے نعلمه۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی ۲۵۹ ویں آیت میں بعض نے نَنشُزُها اور بعض نے تَنشُزُها پڑھا۔

بایں ہمہ عرب اپنے عربی سلیقے سے سمجھ سکتے تھے کہ کہاں کیا پڑھنا ہے۔

لیکن جب اسلامی مملکت میں وسعت کے نتیجے میں عرب و عجم میں اختلاط پیدا ہو گیا تو غیر عربوں کے لیے یہ بات ناممکن تھی کہ بغیر نقاط اور علامات کے اجنبی الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکیں۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں حروف پر نقطہ نگاری کا عمل شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے یحیی بن یعمر اور نصر بن عاصم نے حروف پر نقطے ڈالے۔[1]

واضح رہے کہ نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر دونوں حضرت ابو الاسود دئولی کے شاگرد ہیں جو خود حضرت علی علیہ السلام کے معروف شاگرد تھے۔

**اِعراب:** عربی زبان میں اِعراب زبر، زیر، پیش بھی کلام فہمی میں بہت مدد دیتے ہیں۔ خود عرب تو اہل زبان ہونے کی بنا پر اپنے فطری سلیقے سے کَتَبَ اور کُتِبَ میں فرق بغیر اِعراب کے بھی سمجھ سکتے ہیں لیکن غیر عرب کے لیے یہ بات ناممکن ہے۔ چنانچہ حضرت ابو الاسود دوئلی نے ہی پہلی بار زبر، زیر اور پیش کے لیے علامات وضع کیں۔ چنانچہ: زبر کے لیے حرف کے اوپر دو نقطے، زیر کے لیے حرف کے نیچے دو نقطے اور پیش کے لیے حرف کے سامنے دو نقطوں سے علامات وضع کیں۔

اکثر ان علامتوں کو سرخ رنگ میں لکھا جاتا تھا جب کہ آیات کو اور الفاظ کے نقاط کو سیاہ روشنائی سے تحریر کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے اِعراب والے چند نسخے ابھی تک محفوظ ہیں۔

بعد میں خلیل بن احمد فراہیدی نے اِعراب کی موجودہ شکل وضع کی۔ یعنی زبر کے لیے حرف کے اوپر ایک لکیر، زیر کے لیے حرف کے نیچے ایک لکیر، پیش کے لیے حرف کے اوپر ایک واو، تنوین کے لیے دو لکیریں یا دو واو اور جزم کی علامت کے لیے حرف خ کا سرا علامت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس سے خفیف جزم کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ بعد میں جزم کے لیے حرف میم کا سرا استعمال ہونے لگا۔ اس سے جزم کے سکون ہونے کی طرف اشارہ مقصود ہے اور شد کے لیے شین کا سرا رمز کے طور پر اپنایا گیا۔

☆☆☆☆☆

---

[1] مناهل العرفان ۱: ۳۹۹

# تحریف قرآن

## ایک باطل نظریہ

### قرآن تحریف ناپذیر معجزہ ہے

قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی حقانیت پر اللہ کی طرف سے ایک معجزہ ہے:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝

یہ ایک بالادست کتاب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے آ سکتا ہے، نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے لائق ستائش (رَبْ) کی نازل کردہ ہے۔ (۴۱ حٰمٓ سجدۃ:۴۱۔۴۲)

یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کو معجزہ عنایت کرے، پھر وہ معجزہ ناتمام رہ جائے یا اس معجزے کی طرف باطل قوتوں کو اپنا ہاتھ دراز کرنے کا موقع مل جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) کے معجزات ان کے بیرونی دشمن فرعون اور داخلی دشمن سامری کی دست درازی کی زد میں آ جائیں؟ حاشا و کلا۔

روایت اور نظریہ۔ نظریہ تجسیم۔ خیانت۔ نظریہ جبر اور تحریف۔ وہ نظریات جن سے تحریف قرآن لازم آتی ہے۔ دو گواہ ۔ آیت رجم۔ احادیث سبعۃ احرف ۔ نسخ تلاوت۔

دشمنانِ اسلام نے قدیم زمانے سے اپنی سازشیں اس بات پر مرکوز رکھیں کہ قرآن کو مخدوش اور متنازعہ بنائیں۔ بدقسمتی سے خود امت قرآن کے بعض افراد محض فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اس پروپیگنڈے کو ہوا دینے میں دشمنوں کے ہمدوش ہو گئے کہ فلاں فرقہ تحریف قرآن کا قائل ہے ۔ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ اس الزام سے قرآن کو مشکوک بنا رہے ہیں۔ نظریاتی مخالفین سے عناد اور جاہلانہ تعصب کی وجہ سے ان کے فہم وادراک کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہمارے سارے علماء اپنا اجماعی موقف بیان کریں کہ ہمارے نزدیک تحریف قرآن کا نظریہ سراسر باطل، فرسودہ اور شواذ میں شامل ہے اور ایسے شواذ کسی مسلک و مذہب میں قابل اعتنا نہیں ہوتے، پھر بھی یہ لوگ نہیں مانتے۔ حالانکہ امانت و دیانت کا کوئی شائبہ ہوتا تو اس حد تک بہتان تراشی اور کذب وافترا کا ارتکاب نہ کرتے اور کچھ خوف خدا کرتے۔

ہم ذیل میں اس موضوع سے متعلق کچھ بیان کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ بعض باتوں کا تذکرہ خود ہم پر بھی گراں گزرتا ہے، لیکن ایک موقف کو ذہن نشین کرانے کے لیے کبھی مخاطب کو خود اس کے اپنے حالات کی روشنی میں سمجھانا پڑتا ہے۔ ہم ان حضرات سے معذرت چاہتے ہیں جو اس تنگ نظری اور بد دیانتی و خیانت کے مرتکب نہیں ہیں۔

**روایت اور نظریہ:** کسی مکتب فکر کی کتب میں روایات کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ مکتب فکر ان روایات کے مطابق نظریہ قائم کرتا ہے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مکتب فکر کے علمائے سلف نے ایک نظریہ قائم کیا ہو، لیکن بعد کے علماء اس نظریے پر قائم نہ رہے ہوں۔ اس صورت میں انصاف و دیانت کا تقاضا، کیا یہ ہے کہ اس مکتب فکر کو ان کے علمائے سلف کے نظریے کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے یا موجودہ موقف کو قبول کیا جائے؟

**نظریہ تجسیم:** اللہ تعالیٰ کے جسم اور جسمانی ہونے کے سلسلے میں آپ درج ذیل مطالب کا مطالعہ فرمائیں اور فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں:

☆ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ اپنا قدم جہنم میں ڈال دے گا ۔[1]

---

[1] صحیح بخاری ۲: ۳۳ طبع مصرح ۴۴۷۲۔ صحیح مسلم ۱: ۱۷۲ طبع لکھنو۔
سعودی عرب کے ایک سکول میں استاد نے شاگرد سے پوچھا: بِمَ تعرف ربك؟ یعنی تم اپنے رب کو کس چیز سے پہچانتے ہو؟ شاگرد بولا: برجله المحروق اس کے جلے ہوئے پاؤں سے۔

☆ امام الحنابلہ ابن تیمیہ کا کہنا ہے: خدا عرش سے آسمان دنیا پر اسی طرح اترتا ہے جس طرح ہم اترتے ہیں۔ پھر خود زینے سے اتر کر کہا: اس طرح!![1]

☆ خدا کی آنکھیں دکھنے لگیں تو ملائکہ نے اللہ کی عیادت کی۔ طوفان نوح پر خدا اس قدر رویا کہ آنکھیں سوجھ گئیں۔ عرش پر خدا بیٹھتا ہے تو اس کے بوجھ سے عرش چرچرا تا ہے اور عرش کے چاروں طرف سے خدا کا جسم چار انگل باہر لٹکتا رہتا ہے۔[2]

☆ اللہ کی داڑھی اور علامت مرد و زن کے بارے میں نہ پوچھو۔ باقی جس عضو کے بارے میں جو چاہو پوچھو۔[3]

☆ علمائے سلف ان لوگوں کی تکفیر کرتے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اللہ کہاں ہے اور اللہ کے لیے جگہ کا تعین نہیں کرتے۔[4]

☆ جو شخص یہ نہیں کہتا کہ اللہ زمین میں نہیں، آسمان میں ہے، وہ کافر ہے۔[5]

☆ انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول کریم (ص) نے بارش کو اپنے جسم پر لینے کے لیے لباس ہٹا دیا تو سوال ہونے پر فرمایا: لانہ حدیث العہد بربہ۔ یہ ابھی اپنے رب کے پاس سے آ رہی ہے۔[6]

مولانا شبلی نعمانی ان نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عقائد میں جس طرح درجہ بدرجہ تغیر ہوتا جاتا ہے، اسے ہم ایک خاص مسئلے کی مثال میں پیش کرتے ہیں:
>
> پہلا درجہ: خدا اجسمانی ہے۔ عرش پر متمکن ہے۔ اس کے ہاتھ منہ ہیں۔ خدا نے آنحضرت (ص) کے دوش پر ہاتھ رکھ دیا تو آنحضرت کو (ص) ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔
>
> دوسرا درجہ: خدا جسمانی ہے۔ اس کے ہاتھ، منہ اور پنڈلی ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں جیسی ہماری ہیں۔[7]

اللہ کے جسم اور جسمانی ہونے پر علمائے سلف کے دلائل کا مطالعہ کرنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں جن میں اللہ تعالیٰ کے مجسم ہونے پر بہت سے دلائل قائم کیے گئے ہیں۔

۱۔ کتاب السنۃ۔ تالیف: امام احمد بن حنبل امام الحنابلۃ۔ طبع دار ابن القیم السعودیۃ۔

---

[1] رحلۃ ابن بطوطۃ ۱: ۴۳ باب بعض المشاہد والمزارات (مکتبۃ الشاملۃ) [2] منہاج السنۃ ۱: ۲۳۸ طبع مصر
[3] الشہرستانی: الملل و النحل ۱: ۴۸ طبع بمبئی [4] الدارمی الرد علی الجہمیۃ ص ۹۶
[5] حوالہ سابق [6] حوالہ سابق ص ۲۰ [7] علم الکلام صفحہ ۱۵ طبع اعظم گڑھ

۲۔ کتاب الابانۃ۔۔ تالیف: ابوالحسن اشعری امام الاشاعرہ۔ طبع حیدر آباد دکن۔
۳۔ الرد علی الجھمیۃ۔ تالیف: امام احمد بن حنبل اامام الحنابلۃ۔ طبع دار الوعی حلب۔ شام۔
۴۔ خلق افعال العباد۔ تالیف: محمد بن اسماعیل مؤلف صحیح بخاری۔
۵۔ کتاب العرش والعلو۔ تالیف: الحافظ شمس الدین الذہبی، امام الحدیث۔، مطبع فاروقی دہلی۔ ہندوستان
۶۔ کتاب الرد علی الجھمیۃ۔ تالیف: الامام عثمان بن سعید الدارمی طبع بریل لیدن۔
۷۔ کتاب التوحید۔ تالیف: الامام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ۔ طبع ریاض۔ سعودی عرب۔
۸۔ اجتماع الجیوش الاسلامیۃ۔ تالیف: ابن قیم الجوزیہ۔ طبع مکتبہ ابن تیمیہ۔ قاہرہ۔ مصر۔
۹۔ الشریعۃ۔ تالیف: ابوبکر محمد بن الحسین الاجری الشافعی۔ طبع دار السلام۔ ریاض۔ سعودی عرب۔
۱۰۔ السنۃ۔ تالیف: احمد بن محمد الخلال البغدادی، شیخ الحنابلۃ۔ طبع دمشق۔ شام
۱۱۔ مناھج الدولۃ۔ تالیف: الحکیم ابن رشد۔

ان کتابوں میں اللہ کے جسمانی ہونے پر دلائل موجود ہیں اور ان کے مؤلفین میں سے بعض ائمۂ مذاہب ہیں۔ بعض امام الحدیث ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کتب اور بیسیوں روایات موجود ہیں۔[۱]

ائمۂ مذاہب کے اس نظریے کو بنیاد بنایا جائے اور اللہ کے جسمانی نہ ہونے پر اس مذہب کے دیگر سینکڑوں علماء کے نظریات و دلائل کو نظرانداز کیا جائے اور بقول شبلی نعمانی ''عقائد میں درجہ بدرجہ رونما ہونے والے تغیر'' کو اعتنا میں نہ لایا جائے اور اس مذہب کو ''فرقہ مجسمہ'' قرار دے کر اس کے عقیدہ توحید کو مخدوش قرار دیا جائے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا آپ اس عمل کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ خلوص قرار دیں گے یا آپ کہیں گے کہ اس شخص نے ہمارے مذہب کے ساتھ عناد اور دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان اختلافی مسائل کا گہرا مطالعہ رکھنے والے انصاف پسند ہمارے اس موقف کی حمایت کریں گے

---

[۱] ان کے علاوہ درج ذیل کتب بھی اللہ کے جسمانی ہونے پر دلائل سے پُر ہیں:
۱۔ ابو یعلی۔ نقص التاویلات ۲۔ ابو نصر۔ الابانۃ ۳۔عسال۔ السنۃ ۴۔ ابو بکر عاصم۔ السنۃ ۵۔ طبرانی السنۃ ۶۔حرب السیرجانی۔ الجامع ۷۔حکم بن معبد خزاعی۔ الصفات۔

کہ قرآن کے بارے میں اس سے کہیں کمتر مواد کو بعض مکاتب فکر کے حامیوں نے ہمارے (امامیہ کے) خلاف استعمال کیا اور عدم تحریف کے بارے میں ہمارے علمائے سلف و خلف کے اجماعی موقف کو نظرا نداز کیااور شواذ کو ہمارے خلاف دلیل بنایا۔ اگر بفرض محال امامیہ کے بارے میں یہ موقف صحیح ہے تو اس کی زد میں خود اعتراض کنندہ بھی آ جاتا ہے، کیونکہ شواذ تو ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔ امام عبد الوہاب شعرانی کو اگر لوگوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ ان تمام آیات کو بیان کرتے جو مصحف عثمان سے رہ گئی ہیں:

| | |
|---|---|
| لو لا ما یسبق للقلوب الضعیفة و وضع الحکمة فی غیر اهلها لبینت جمیع ماسقط من مصحف عثمان۔[1] | اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ کم فہم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے نیز نااہل لوگوں کے ہاتھوں حکمت آ جائے گی تو میں ان سب آیات کو بیان کر دیتا جو مصحف عثمان سے رہ گئی ہیں۔ |

دیوبند کے صدر المدرسین شیخ الحدیث سید انور شاہ کشمیری کی تحقیق کے مطابق بھی قرآن میں لفظی تحریف واقع ہوگئی ہے۔ بقول ان کے:

| | |
|---|---|
| والذی تحقق عندی ان التحریف فیه لفظی اما انه عن عمد منهم او لغفلة۔[2] | میرے نزدیک تحقیق شدہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تحریف لفظی واقع ہوئی ہے، خواہ عمداً ہو یا غفلت کی بنا پر۔ |

چنانچہ فیض الباری کے فاضل محشی شیخ الحدیث مولانا محمد بدر عالم استاد الحدیث دیوبند نے اپنے ذیلی حاشیہ البدر الساری میں مندرجہ بالا عبارت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

سید محمود آلوسی بغدادی تفسیر روح المعانی کے مقدمہ میں اور شیخ الحدیث حبیب الرحمٰن کاندھلوی صدیقی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| نعم اسقط زمن الصدیق مالم یتواتر او ما نسخت تلاوته۔ | ہاں صدیق (حضرت ابوبکر) کے زمانے میں وہ آیات جو متواتر نہ تھیں یا جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی تھی حذف کی گئیں۔ |

قرآن کے بارے میں مجموعی طور پر مذہب اشعری کے ایک گروہ کا نظریہ دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اس اسلامی فرقے کا ایسا نظریہ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ نظریہ اس طرح ہے:

| | |
|---|---|
| ان القرآ ن لم ینزل قط علی قلب محمد علیه الصلوة و السلام ۔ و ان مانقرأ فی الصلوة و نحفظ فی | اللہ تعالیٰ کا کلام جبرئیل علیہ السلام نے قلب محمد (ص) پر نازل نہیں کیا اور جو چیز ہم نماز میں پڑھتے اور سینے میں (قرآن کے نام سے) محفوظ رکھتے ہیں، ان |

---

[1] کبریت احمر بر حاشیة الیواقیت و الجواهر ۱: ۱۳۹۔ طبع مصر
[2] فیض الباری علی صحیح البخاری ۳: ۳۹۵

الصدور ليس هو القران البتة۔[1]

میں سے کوئی چیز کلام اللہ نہیں ہے۔

اسی کتاب میں یہ عبارت بھی آپ پڑھیں گے (جسے ہم بخوشی نقل نہیں کر رہے ہیں):

ولقد اخبرني علي بن حمزه المرادي الصقلي انه راى بعض الاشعرية يبطح المصحف برجله قال :فاكبرت ذالك وقلت له:ويحك هكذاتصنع بالمصحف و فيه كلام الله تعالىٰ؟فقال:ويلك والله مافيه الاالسخام والسوادواما كلام الله فلا۔

علی ابن حمزہ مرادی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے مذہب اشعری کے ایک پیروکار کو دیکھا کہ وہ اپنے پاؤں سے قرآن کو ٹھوکر مار رہا تھا۔میں نے اسے بڑی جسارت سمجھ کر اس سے کہا: افسوس ہوتم پر، اس مصحف کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو جب کہ اس میں اللہ کا کلام ہے؟ اس نے کہا: تباہی ہوتم پر، قسم بخدا اس میں کلام خدانہیں بلکہ صرف سیاہ لکیریں ہیں۔

آگے لکھتے ہیں:

و كتب الى ابو المرحى بن رزوار المصرى : ان بعض ثقات اهل مصر من طلاب السنن اخبره : ان رجلا من الاشعرية قال له مشافهة: على من يقول ان الله قال: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ الف لعنة.

اور ابو المرحی بن رزوار مصری نے مجھے لکھا کہ مصر کے بعض ثقہ طالب علموں نے اسے بتایا کہ ایک اشعری نے اس سے بالمشافہ کہا: جوشخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ کہا ہے، اس پر ہزار لعنت ہو۔

ہمارا مؤقف یہ ہے کہ اس قسم کے شواذ کی کوئی اہمیت نہیں اور اجماع امت کے خلاف شاذ و نادر اقوال قابل اعتنا نہیں ہیں۔یعنی جس طرح مذہب اشعری کے ماننے والے ایسے اقوال کو اہمیت نہیں دیتے ہم بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

**امانت:** جامعة الازهر کے جلیل القدر استاد الشیخ محمد غزالی کو ان کی امانت اور دیانتداری نے ان لوگوں کے خلاف قلم اٹھانے پر مجبور کیا جو امامیہ پر تحریف قرآن کے قائل ہونے کی جھوٹی تہمت لگا کر غیر شرعی حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجھے بعض لوگوں پر سخت افسوس ہوتا ہے جو بلا تحقیق بات کر جاتے ہیں اور نتائج کی پرواہ کیے بغیر تہمتیں لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مریض اخلاق کے ساتھ اسلام کے فکری میدان میں قدم رکھتے ہیں اور اسلام و امت مسلمہ کے خلاف گستاخی کرتے ہیں۔میں نے ایک محفل میں کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

---

[1] ابن حزم ۔الفصل فی الملل و النحل ۴:۱۵۹۔طبع مصر

شیعوں کا ایک اور قرآن ہے جو ہمارے معروف قرآن سے مختلف ہے۔ میں نے اس سے کہا: وہ قرآن کہاں ہے؟ عالم اسلام تین براعظموں پر پھیلا ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے لے کر آج تک چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور لوگوں کو صرف ایک ہی قرآن کا علم ہے جس کے آغاز و اختتام اور سورہ و آیت کی تعداد تک معلوم ہے۔ پس یہ دوسرا قرآن کہاں ہے؟ اتنے طویل عرصے سے کسی جن و انس کو اس کے کسی نسخے کا علم کیوں نہ ہو سکا؟ یہ بہتان کیوں لگایا جاتا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کس کے مفاد کے لیے کیا جاتا ہے؟ اس سے اپنے بھائیوں اور کتاب اللہ کے بارے میں بدگمانیاں پھیلتی ہیں۔ قرآن ایک ہی ہے جو اگر قاہرہ میں چھپتا ہے تو اسے نجف اور تہران میں بھی مقدس سمجھا جاتا ہے... پھر بعض لوگوں پر نیز وحی الٰہی پر ایسے بہتان کیوں باندھے جاتے ہیں؟[1]

شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند علامہ شمس الحق اپنی کتاب علوم القرآن میں لکھتے ہیں:

شیعوں کا نظریہ وہی ہے جو سنیوں کا ہے کہ قرآن مکمل طور پر محفوظ ہے جس میں ایک آیت کی کمی و بیشی نہیں ہوئی۔ اس بات کی دلیل کے لیے شیعوں کی متعدد کتب کا حوالہ پیش کرتا ہوں۔[2]

مشہور مفسر علامہ عبد الحق حقانی اپنی معروف تفسیر فتح المنان فی تفسیر القرآن المعروف تفسیر الحقانی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

آج تک سلف سے لے کر خلف تک کوئی محقق شیعہ بلکہ کوئی اہل اسلام بھی یہ عقیدہ (کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے) نہیں رکھتا۔ چنانچہ شیعہ علماء اس خیال کی برائت اپنی کتب میں بڑی شدو مد سے کرتے ہیں۔[3]

خیانت: حضرت علامہ رحمۃ اللہ کیرانوی اپنی معروف تصنیف اظہار الحق جلد دوم صفحہ ۸۹ تا ۹۰ میں عدم تحریف قرآن کے بارے میں امامیہ کا واضح موقف نقل کرتے ہیں اور امامیہ کے علمائے سلف کے اقوال سے اس موقف کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ کتاب قاہرہ، استنبول، مغرب عربی اور کراچی سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔ ترکی، فرانسیسی، انگریزی، گجراتی اور اردو زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا ہے مگر کسی ایڈیشن میں کوئی کمی و بیشی اور خیانت نہیں ہوئی۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ سعودی عرب کا معروف ادارہ

---

[1] دفاع عن العقیدۃ و الشریعۃ۔ صفحہ ۲۶۶۔ طبع دار الکتب الحدیثۃ۔ مصر ۱۹۷۵ء
[2] علوم القرآن ۱۳۴ [3] تفسیر حقانی ۱: ۶۳ طبع دیوبند

رئاسة الادارات للبحوث العلمية و الافتاء والدعوة والارشاد (ریاض) کی طرف سے شائع شدہ کتاب اظہار الحق میں انتہائی علمی بد دیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈھائی صفحات پر مشتمل وہ متن حذف کر دیا گیا ہے جس میں مؤلف نے ثابت کیا تھا کہ اہل تشیع عدم تحریف قرآن کے قائل ہیں۔

**نظریہ جبر اور تحریف:** ہمارے شامی دوست سعد رستم ناقل ہیں کہ ایک روز اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے مصری اور مقامی اساتذہ شیعوں کے ایمان بالقرآن پر گفتگو کر رہے تھے اور اس بات کو مسلمہ مان رہے تھے کہ شیعہ اس قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ حال دیکھ کر مجھے بھی شک ہوا اور میں نے گھر جا کر اپنی ایرانی نژاد شیعہ بیوی سے سوال کیا: کیا شیعہ اس قرآن کو نہیں مانتے؟ میری بیوی کے جواب کا لب و لہجہ دیکھ کر مجھے یقین آیا کہ شیعہ اسی قرآن پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے دن میں نے اساتذہ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس کی جو توجیہ کی وہ ایک یادگار لطیفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: دراصل شیعہ علماء اپنے عوام پر اس عقیدے کا اظہار نہیں کرتے کہ وہ اس قرآن کو نہیں مانتے، جیسا کہ ہم عقیدۂ جبر کا اپنے عوام کے سامنے اظہار نہیں کرتے۔

اسلامی یونیورسٹی کے اساتذہ کی خدمت میں مؤدبانہ عرض ہے کہ نظریۂ جبر پر آپ کا جبر نہیں چل سکا اور یہ نظریہ خواص کے ساتھ بہت سے عوام تک پہنچا ہوا ہے، البتہ آپ اس کا پرچار نہیں کرتے۔ شاید اس میں آپ اپنی خفت محسوس کرتے ہوں گے۔ اگر امامیہ اس قسم کا عقیدہ رکھتے تو اس پر ہمارا بھی جبر نہ چلتا اور یہ بات کسی نہ کسی طرح اپنے عوام تک پہنچ جاتی۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما اضمر احد شيئا الا ظهر في فلتات لسانه وصفحات وجهه۔[1]

جس کسی نے بھی کوئی بات دل میں چھپا کر رکھنا چاہی وہ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلے ہوئے الفاظ اور چہرے کے آثار سے ضرور نمایاں ہو جاتی ہے۔



**وہ نظریات جن سے تحریف قرآن لازم آتی ہے:** امامیہ ان نظریات کو مسترد کرتے ہیں، جن سے قرآن کا تحفظ مخدوش ہوتا ہے:

۱۔ **دو گواہ:** یہ بات اہل سنت کے مصادر میں مسلم سمجھی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں قرآن زید بن ثابت انصاری کے زیر ادارت صرف دو گواہوں کی شہادت کی بنیاد پر جمع کیا گیا۔ یعنی اگر دو گواہوں نے شہادت دی کہ یہ عبارت قرآن کا حصہ ہے تو اسے قرآن میں شامل کر لیا گیا، بلکہ چند آیات تو صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کی گواہی پر قرآن میں شامل کی گئیں۔

یہاں درج ذیل دلچسپ نکات کا ملاحظہ ضروری ہے:

---

[1] نہج البلاغہ: کلمات قصار: ۲۵

i۔ ثبوت قرآن کے لیے تواتر کے شرط ہونے پر اجماع قائم ہے۔ تواتر کے بغیر قرآن ثابت نہیں ہوتا۔

ii۔ اگر بفرض محال دو گواہوں کی بنیاد پر ہی قرآن ثابت ہوتا ہے تو پھر قرآن میں تحریف خود بخود لازم آجاتی ہے کیونکہ اہل سنت کے مصادر کے مطابق ایسی بہت سی آیات موجود ہیں جن کے قرآن ہونے پر دو سے زائد شہادتیں موجود ہیں مگر اس کے باوجود یہ آیات موجودہ قرآن میں نہیں ہیں مثلاً:

۱۔ آیت رجم: الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجموهما.

درج ذیل جلیل القدر اصحاب اس آیت کو قرآن کا حصہ قرار دیتے ہیں:

۱۔ حضرت عمر (صحیح بخاری ۳: ۶۸ طبع مصر و صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ)
۲۔ حضرت عائشہ (سنن ابن ماجہ: ۱۴۱)
۳۔ اُبی بن کعب (الاتقان ۲: ۲۵)
۴۔ زید بن ثابت (الاتقان ۲: ۲۵)

۲۔ آیت مال: انا انزلنا المال لاقام الصلوة وایتاء الزکوة۔

گواہان: ۱۔ ابی بن کعب (الدر المنثور ۶: ۳۷۸)
۲۔ زید بن ارقم (حوالہ سابق)
۳۔ جابر بن عبداللہ (حوالہ سابق)
۴۔ بریدۃ (حوالہ سابق)
۵۔ ابوموسی اشعری (صحیح مسلم)
۶۔ ابو واقد لیثی (الاتقان)
۷۔ عبداللہ بن مسعود (محاضرات راغب)

۳۔ آیت رغبت: لا ترغبوا عن آبائکم فانه کفر ان ترغبوا عن آبائکم

گواہان: ۱۔ حضرت عمر (صحیح بخاری)
۲۔ عبداللہ بن عباس (الاتقان)
۳۔ زید بن ثابت (الاتقان)

۴۔ آیت جہاد: ان جاهدوا کما جاهدتم اول مرة۔

گواہان: ۱۔ حضرت عمر (الاتقان ۲: ۲۵)
۲۔ عبدالرحمٰن بن عوف (الاتقان ۲: ۲۵)

۵۔سورۃ الخلع: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم انا نستعینك ونستغفرك ☆ و نثنی علیك و لا نکفرك ☆ ونخلع ونترك من یفجرك ☆

۶۔سورۃ الحفد: بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ اللھم ایاك نعبد ☆ و لك نصلی و نسجد ☆ و الیك نسعی ونحفد ☆ نرجوا برحمتك ☆ و نخشی عذابك ان عذابك بالکافرین ملحق ☆

ان دوسورتوں کے قرآن کا حصہ ہونے پر درج ذیل اصحاب کی گواہی نقل کی گئی ہے:

گواہان: ۱۔حضرت عمر بن خطاب (الدر المنثور ۶: ۴۲۰)

۲۔حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام (مجمع الزوائد ۷: ۱۵۷)

۳۔حضرت ابی بن کعب (الاتقان ۲: ۶۶)

۴۔حضرت عبداللہ بن عباس (روح المعانی ۱: ۲۵ طبع مصر)

۵۔حضرت ابوموسیٰ اشعری

۲۔احادیث سبعة احرف: صحاح اور دیگر کتب میں متعدد احادیث میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: قرآن سات حروف میں نازل ہوا۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

اقرأنی جبرئیل علی حرف فراجعته فلم ازل استزیده و یزیدنی حتی انتهی الی سبعة احرف۔[1]

مجھے جبرئیل نے قرآن ایک حرف (طریقے) سے پڑھایا، میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اضافے کی درخواست کرتا گیا یہاں تک کہ سات حرفوں (طریقوں) سے پڑھنے کی اجازت مل گئی۔

احادیث سبعة احرف مختلف عبارات میں، صحاح و غیر صحاح میں عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے مروی ہیں۔ ان روایات کی مختلف تاویلات بھی کی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ معروف و مشہور توجیہ یہ ہے: ”قرآنی الفاظ کو قریب المعنی الفاظ میں بدلا جا سکتا ہے۔“ حلانکہ اس طرح قرآن کی معجزانہ ہیئت ترکیبی کا حلیہ تبدیل ہوجاتا ہے اور یہی تحریف ہے۔ مثلاً اس بات کی تصریح کی گئی:

۱۔ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا میں صَوۡمًا کی جگہ صمتا پڑھنا جائز ہے۔[2]

۲۔ کُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِیۡهِ میں مَّشَوۡا کی جگہ سعوا یا مروا پڑھا جا سکتا ہے۔[3]

۳۔ابوہریرہ کے نزدیک عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا کی جگہ غفوراً رحیما پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔[4]

---

[1] صحیح بخاری باب: انزل القرآن علی سبعة احرف ۴: ۱۹۰۹۔ صحیح مسلم ۱: ۵۶۱

[2] تذکرۃ الحفاظ ۱: ۳۴۰ طبع دکن [3] الاتقان ۱: ۴۷ [4] حوالہ سابق

۴۔ اَوۡ یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ میں زُخۡرُفٍ کی جگہ ذھـــب پڑھنا درست ہے۔[1]

۵۔ ابن مسعود کے نزدیک العھن کی جگہ الصوف پڑھا جا سکتا ہے۔[2]

۶۔ اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً کی جگہ اِلا ذ قیة واحدة پڑھا جا سکتا ہے۔[3]

۷۔ ابو ہریرہ کے نزدیک جَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ کی جگہ جاءت سکرة الحق بالموت پڑھنا بھی درست ہے۔[4]

۸۔ ابو درداء کی روایت ہے کہ طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ کی جگہ طعام الفاجر پڑھا جا سکتا ہے۔[5]

اس نظریے کو قبول کرنے کی صورت میں دو باتیں ناگزیر ہوتی ہیں:

۱۔ تحریف کا وقوع۔

۲۔ تحریف کا جواز۔

پہلی بات یہ کہ جب قرآن سات حرفوں (طریقوں) پر نازل ہوا ہے اور اس وقت ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن ہے وہ ایک حرف پر مشتمل ہے تو باقی چھ حرفوں والا قرآن کہاں ہے؟

دوسری بات یہ کہ اگر ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا جائز ہے تو اس کا لازمہ یہ ہوا کہ تحریف جائز ہے۔ اسی وجہ سے امامیہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، کیونکہ ایسا کرنے کا حق تو خود رسول اللہ (ص) کو بھی نہیں تھا۔

ارشاد ہے:

قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ[6]

کہہ دیجیے: مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو اس وحی کا تابع ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔

تحریف قرآن کے بارے میں اگر امامیہ مصادر میں کوئی روایات موجود ہوں تو بھی امامیہ ان روایات پر مبنی کوئی نظریہ قائم نہیں کرتے بلکہ ان کی توجیہ و تاویل کرتے ہیں۔ اگر تاویل ممکن نہ ہو تو کتاب خدا کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہیں مسترد کرتے ہیں۔

لیکن اہل سنت حضرات اپنے مصادر میں موجود تحریف کی روایات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے ان روایات پر مبنی نسخ تلاوت کا نظریہ قائم کرتے ہیں۔ اسی طرح ان روایات کی بنا پر بعض آیات کو قرآن کا حصہ تسلیم کرنے کے بعد ''نسخ تلاوت'' کے نظریہ کے ذریعے اس کی قرآنیت سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں، جب کہ ''نسخ

---

۱۔ حوالہ سابق
۲۔ تفسیر طبری ۱: ۱۸
۳۔ تاویل مشکلات القرآن ۱۹ طبع مصر
۴۔ تفسیر الطبری ۱: ۱۸
۵۔ حوالہ سابق ۲۵: ۱۳۱
۶۔ ۱۰ یونس: ۱۵

تلاوت'' ثابت نہیں ہے۔

۳۔ نسخ تلاوت۔ اہل سنت کے مصادر میں آیا ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات زمان رسول(ص) میں قرآن کا حصہ تھیں ۔ انہ کان قرآن علی عھد رسول اللّٰہ ۔ مثلاً آیہ رجم، آیہ رضاعت اور آیہ رغبت کے قرآن کا حصہ ہونے کے بارے میں صحیحین میں روایت موجود ہے ۔

طبرانی نے موثق سند سے حضرت عمر سے روایت کی ہے : ''قرآن دس لاکھ ستائیس ہزار حروف پر مشتمل ہے''۔ جب کہ موجودہ قرآن اس مقدار کا ایک تہائی بھی نہیں ہے۔

وہ اس قسم کی بہت سی روایات کو مسترد کرنے کی بجائے موجودہ قرآن میں غیر موجود چیزوں کو قرآن کا حصہ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ صحاح ستہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن صحاح کا بھرم رکھنے کے لیے یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ ان آیات کو نسخ تلاوت کے ذریعے قرآن سے حذف کر دیا گیاہے۔ چنانچہ شیخ الحدیث حبیب الرحمٰن کاندھلوی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں :

> حضرت ابوبکر کے زمانے میں وہ آیات جو متواتر نہ تھیں اور جن کی تلاوت منسوخ ہوگئی تھی حذف کر دی گئیں۔

نسخ تلاوت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔اپنی صحاح میں موجود روایات کی بنا پر انہوں نے بہت سی عبارات کو قرآن کا حصہ تسلیم کر لیا، پھر ان سے ہاتھ اٹھانے کے لیے نسخ تلاوت کا جواز پیش کیا۔ اس بارے میں دوسروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان سے اس ''نسخ تلاوت'' کا مدرک و مأخذ طلب کریں۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ ان کے پاس اس کا کوئی مدرک اور سند موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ نسخ رسول کریم (ص) کے زمانے میں ہوا ہو تو اسے ثابت کرنے کے لیے تواتر کی ضرورت ہے۔ بلکہ بعض ائمہ فقہ جیسے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک تو خبر متواتر سے بھی نسخ قرآن ثابت نہیں ہو سکتا ۔بعض فقہاء خبر متواتر سے نسخ قرآن کو جائز سمجھتے ہیں لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کے قائل نہیں اور خبر واحد کے ذریعے نسخ قرآن کا تو کوئی قائل نہیں ہے۔ لہٰذا نسخ تلاوت پر صحاح میں موجود روایات کے علاوہ کوئی اور دلیل موجود ہی نہیں ہے۔

نکتہ: نسخ تلاوت کی صحت صحاح کی روایت کی صحت پر موقوف ہے۔ جب کہ صحاح کی روایت کی صحت نسخ تلاوت کی صحت پر موقوف ہے۔ لہٰذا نسخ تلاوت کی صحت خود نسخ تلاوت کی صحت پر موقوف ہے، جسے علمی زبان میں دور مصرّح کہتے ہیں جس کا بطلان بدیہی ہے۔

اگر یہ نسخ رسول کریم (ص) کے بعد ہوا ہے تو یہ صریحاً تحریف ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ نسخ تلاوت کے قائل ہیں وہ تحریف کے بھی قائل ہیں۔ یعنی ان کے اس نظریے سے، خواہ

وہ نہ بھی چاہیں، تحریف لازم آئے گی۔ اسی لیے بعض معاصر غیر امامیہ علماء بھی نسخ تلاوت کو مسترد کرتے ہیں۔[1]

---

[1] صبحی صالح ۔ علوم القرآن

# روایات تحریف کے بارے میں
# مذہب امامیہ کا مؤقف

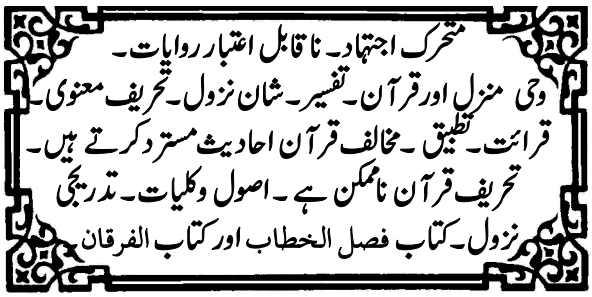

دیگر مکاتب فکر کی معتبر کتب کی طرح شیعہ کتب میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جن میں سے بعض سے بادی النظر میں تحریف کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور کچھ میں صراحت موجود ہے، مگر شیعہ ان روایات کے تحت نسخ کا نظریہ قائم نہیں کرتے بلکہ ان روایات کی یا تو توجیہ کرتے ہیں کہ ان سے مراد تحریف لفظی نہیں اور اگر قابل توجیہ نہیں ہیں تو ایسی روایات کو مخالف قرآن سمجھ کر یکسر مسترد کرتے ہیں ۔

**۱۔ متحرک اجتہاد:** اہل تشیع کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے، لہٰذا ان کی نظر میں متحرک و زندہ اجتہاد کی وجہ سے کوئی کتاب حرف آخر نہیں ہے، بلکہ ہر کتاب، ہر روایت قابل بحث و تحقیق ہے اور تمام اسلامی نصوص تحقیق و تدقیق کے قابل ہیں ۔

چنانچہ اصول کافی اگرچہ کتب شیعہ میں سے مشہور کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اس میں مختلف احادیث موجود ہیں۔ بعض احادیث اگر کچھ مجتہدین کے نزدیک صحیح السند ہیں تو ضروری نہیں کہ دوسرے مجتہدین کی نظر میں بھی وہ صحیح السند ہوں۔ جو مسلمان صحاح ستہ کی روایات کا صحیح السند ہونا ضروری اور لازمی تصور کرتے ہیں ان کے لیے ممکن ہے کہ صحاح میں کسی روایت کا موجود ہونا اس روایت کے مضمون کا ضمنی اعتراف بن جائے لیکن شیعہ کتب میں اگر کوئی روایت موجود ہے تو اسے مضمون کا ضمنی اعتراف تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے اس سلسلے میں سب سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے بحار الانوار میں صریحاً کہا ہے کہ قرآن میں قطعاً کوئی تحریف نہیں ہوئی ۔

**۲۔ ناقابل اعتبار روایات:** تحریف قرآن کے بارے میں اکثر شیعہ روایات ضعیف راویوں سے منقول ہیں۔ چنانچہ ان روایات میں ایک قابل توجہ سلسلہ روایت احمد بن محمد السیاری پر منتہی ہوتا ہے ۔ علمائے شیعہ فرماتے ہیں کہ تحریف قرآن سے مربوط تین سو (۳۰۰) روایات احمد بن محمد السیاری سے مربوط ہیں ۔

السیاری کون ہے؟ شیعہ کتب رجال میں احمد بن محمد السیاری کے بارے میں درج ذیل الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

وہ ضعیف الحدیث، فاسد المذہب، غالی اور منحرف ہے۔[1]

ان روایات تحریف میں یونس بن ظبیان کا نام بھی آتا ہے۔ اس شخص کو علمائے رجال نے ان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے:

یہ نہایت ضعیف، ناقابل توجہ، غالی، کذاب اور احادیث گھڑنے والا ہے۔[2]

پھر ان میں منخل بن جمیل الاسدی کوفی کا نام بھی آیا ہے جس کے بارے میں علمائے رجال نے لکھا ہے:

وہ فاسدالروایہ، ضعیف، غالی اور منحرف ہے۔[3]

محمد بن حسن بن جمہور بھی ان راویوں میں شامل ہے جس کے بارے میں علمائے رجال فرماتے ہیں:

ضعیف، غالی، فاسدالروایہ، ناقابل توجہ اور فاسدالمذہب ہے۔[4]

**۳۔ وحی منزل اور قرآن:** اکثر روایات میں مضمون حدیث اس طرح ہے: نزلت فی فلاں ھکذا نزلت وغیرہ۔ علماء اور محققین سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ رسول خدا (ص) پر جو کچھ بھی بطریق وحی نازل ہوتا ہے، ان سب کا قرآن ہونا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اگر روایت یوں کہے: یہ وحی یوں نازل ہوئی یا فلاں ہستی کے بارے میں نازل ہوئی، اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرمان الٰہی ہے اور بطور وحی نازل ہوئی ہے، لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قرآن کا حصہ ہے، کیونکہ ہر وحی قرآن نہیں۔ یاد رہے کہ پورا قرآن وحی ہے، لیکن ہر وحی قرآن نہیں۔

شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| کان ثابتا منزلا و ان لم یکن من جملة کلام اللّٰہ تعالیٰ الذی ھو القرآن المعجز۔[5] | اگرچہ نازل ہوا ہے لیکن وہ کلام اللہ نہیں ہے جو قرآن اور معجزہ ہے۔ |

شیخ صدوقؒ اپنے اعتقادیہ صفحہ ۸۵ میں ایک حدیث کا مفہوم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| بل نقول انہ قد نزل من الوحی الذی لیس من قرآن مالو جمع الی القرآن لکان مبلغہ مقدار سبع | یہ وحی کے طور پر نازل ہوئی تھی مگر قرآن کا حصہ نہ تھی۔ اگر ان کو قرآن کے ساتھ جمع کیا جائے تو (مجموعی طور پر) ستر ہزار آیات بن جاتی ہیں۔ اس قسم کی روایات |

---

[1] قاموس الرجال ج۱ ص۴۰۳۔ طبع تہران۔ رجال نجاشی ص ۵۸۔ طبع بمبئی۔ نقد الرجال ص۳۲ طبع ایران قدیم۔ معجم رجال الحدیث ج۲ ص ۲۹۔ طبع نجف

[2] نقد الرجال ص۳۸۱ [3] دراسات فی الحدیث و المحدثین۔ نقد الرجال ص۳۵۴

[4] نقد الرجال ص ۲۹۹۔ رجال نجاشی ص ۲۳۸۔ طبع بمبئی [5] اوائل المقالات ص ۵۵

عشرة الف آیة، (الی ان قال) و مثل بہت ہیں۔ یہ سب وحی تو ہیں مگر قرآن نہیں ہیں۔
هذا كثير كله وحي ليس بقرآن۔

**۴۔ تفسیر:** احادیث کے بعض الفاظ تفسیر قرآن کی غرض سے (جملہ معترضہ کے طور پر) آیت کے وسط میں درج ہوئے ہیں۔

چنانچہ کافی میں حضرت امام جعفر الصادق (ع) سے یہ آیت اس طرح نقل کی گئی ہے:

وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا (عما امرتم) فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا [1]

اس آیت میں عما امرتم بغرض تفسیر و توضیح آیت کے وسط میں مذکور ہے، نہ کہ قرآن کے طور پر.

**۵۔ شان نزول:** بعض الفاظ شان نزول کے بیان کے لیے آیت کے وسط میں مذکور ہوئے ہیں جیسے:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ [1] (فی علی) وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ [1] ۔[2]

چنانچہ حضرت عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے آیہ حافظوا علی الصلوات و الصلوة الوسطی کے ساتھ و صلوة العصر پڑھا ہے۔[3] علمائے اہل سنت تو ایسی روایات سے ان الفاظ کو قرآن کا حصہ تسلیم کر لینے کے بعد توجیہ کرتے ہیں، لیکن علمائے شیعہ انہیں قرآن کا حصہ تسلیم کرنے سے پہلے ہی ان کی توجیہ کرتے ہیں۔

**۶۔ تحریف معنوی:** روایات میں تحریف کا لفظ صریحاً موجود ہے لیکن ان میں تحریف سے مراد تحریف معنوی ہے۔ تحریف معنوی کا مطلب یہ ہے کہ مفاد پرستوں نے آیات قرآنی کے مطالب کو ان کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنی رائے اور ذاتی یا گروہی خواہشات کے مطابق معنی پر محمول کیا ہے۔ حضرت علی (ع) نے فرمایا:

لا يعرفون الا خطه [4] وہ لوگ قرآن کے صرف خطوط، نقوش کو پہچانتے ہوں گے۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ لوگ قرآن میں معنوی تحریف تو کریں گے لیکن الفاظ قرآن محفوظ رہیں گے۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

و كان من نبذهم الكتاب ان اقاموا انہوں نے کتاب خدا کو اس طرح پس پشت ڈال

---

[1] ۴ نساء: ۱۳۵ [2] ۵ مائدہ: ۶۷ [3] درمنثور ۱: ۳۰۴ [4] نہج البلاغة خ ۱۴۵ ص ۳۸۸

حروفه و حرفوا حدوده، فهم يروونه ولا يرعونه و الجهال يعجبهم حفظهم للرواية و العلماء يحزنهم تركهم للرعاية۔[1]

دیا کہ اس کے حروف کی پاسداری تو کی مگر اس کی حدود میں تحریف کی۔ یہ لوگ روایت تو کرتے ہیں مگر رعایت نہیں کرتے نادان لوگ روایت کے تحفظ کو پسند کرتے ہیں اور علماء رعایت کے متروک ہونے سے غمزدہ ہوتے ہیں۔

حضرت علی(ع) سے روایت ہے:

وليس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الكتاب اذا تلى حق تلاوته ولا انفق منه اذا حرف عن مواضعه۔[2]

اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جب اسے صحیح طور پڑھا جائے اور قرآن سے زیادہ کوئی چیز مقبول نہ ہوگی جب اسے اپنی جگہ سے ہٹا کر تحریف کی جائے۔

**۷۔ قراءت:** ان روایات میں بہت سی عبارتوں کا تعلق اختلاف قراءت سے ہے جیسا کہ اصحاب رسولؐ(ص) میں سے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ کی قراءتوں میں اختلاف ہے۔ اس طرح ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بعض قراءتوں میں دوسروں سے اختلاف کیا ہے۔

**۸۔ تطبیق:** قرآن ایک ابدی دستور حیات ہے۔ بنا بریں قرآن نزول کے وقت جس امر پر منطبق ہوتا تھا، اسی طرح بعد کے ہر اس امر پر بھی جاری و منطبق ہوگا جس میں حال نزول کے حالات و شرائط موجود ہوں۔ اگر زمان نزول میں کسی آیت میں کسی کی مدح ہوئی ہے تو اس قسم کے اوصاف رکھنے والے سب لوگوں پر یہ مدح منطبق ہوگی۔ اگر کسی آیت میں کسی فرد کی مذمت ہوئی ہے تو یہ قدح اس قسم کے تمام اشخاص پر منطبق ہوگی۔ مفسرین یہاں پر ایک قاعدہ کلیہ قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں: العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب یعنی شان نزول و سبب نزول پر انحصار نہیں ہوسکتا بلکہ لفظ کے عموم کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔

اس کے تحت بعض غیر قرآنی الفاظ آیت کی تطبیق کے لحاظ سے قرآنی الفاظ کے ساتھ (توضیح و تبیین کی غرض سے) درج ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض روایات میں ہے:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا (حق آل محمد) اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔[3]

اس آیت کے وسط میں (حق آل محمد) صرف بیان مصداق اور بیان مورد انطباق کی غرض سے مذکور ہے، جزو قرآن ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔

**۹۔ مخالف قرآن احادیث مسترد ہیں:** اگر کوئی روایت گزشتہ تمام مطالب میں سے کسی ایک پر بھی محمول نہ ہو سکے تو ایسی روایات کو شیعہ اصول حدیث کے مطابق، منافی قرآن و سنت ہونے کی وجہ سے

---

[1] الوافی کتاب الصلوٰۃ ج ۱ ص ۱۸۵۔ طبع قم
[2] نہج البلاغۃ خ ۱۴۵ ص ۳۸۷
[3] ۲۶ شعراء: ۲۲۷

رد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی روایت قرآن کی صریح نص اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [1] کی مخالف ہے تو اس کی کوئی قیمت اور حیثیت نہیں ہے اور وہ درجہ اعتبار سے بالکل ساقط ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

ان علی کل حق حقیقة و علی کل صواب نوراً فما وافق کتاب اللّٰه فخذوه و ما خالف کتاب اللّٰه فدعوه۔ [2]

ہر حق پر ایک حقیقت اور ہر صائب بات پر ایک روشنی ہوا کرتی ہے۔ پس جو کتاب خدا کے مطابق ہو اسے اخذ کرو، جو کتاب خدا کے مخالف ہو اسے مسترد کرو۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

لا تصدق علینا الا ما وافق کتاب اللّٰه و سنة نبیّه (ص)۔ [3]

ہماری صرف ان احادیث کی تصدیق کرو جو کتاب اللہ اور سنت رسول (ص) کے مطابق ہوں۔

امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

فما وافق کتاب اللّٰه فخذوه وما خالف کتاب اللّٰه فدعوه۔ [4]

جو کتاب خدا کے مطابق ہو اسے اخذ کرو اور جو اس کے مخالف ہو اسے رد کرو۔

اور مسلک امامت کے آٹھویں تاجدار حضرت امام رضا (ع) نے فرمایا ہے:

اذا کانت الروایات مخالفة للقرآن کذبتها۔ [5]

جو روایات قرآن کریم کی مخالف ہوں میں ان کی تکذیب کرتا ہوں۔

**تحریف قرآن ناممکن ہے:** قرآن میں تحریف اس لیے ناممکن ہے کہ اس کی معجزاتی ترکیب اپنے اندر کسی قسم کی تحریف کو قبول نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

**۱۔ اصول وکلیات:** گزشتہ امتوں پر نازل شدہ کتب میں تحریف واقع ہونے کے اہم عوامل میں سے ایک عامل یہ تھا کہ آسمانی کتب میں جو دستور حیات دیا گیا تھا وہ حکمرانوں اور مفاد پرستوں کے مفادات کے خلاف ہوتا تھا، لہٰذا کچھ لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ کچھ نے ان حقائق کو چھپانے کی کوشش کی اور کچھ نے تحریف کر ڈالی۔

لیکن خاتم الانبیاء (ص) کے ابدی معجزے قرآن کو تحریف سے محفوظ رکھنے کا انتظام خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ نے قرآن میں صرف اصول وکلیات ہی بیان کیے اور تفسیر وتشریح کا کام

---

[1] ۱۵ حجر: ۹۔ اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ [2] اصول الکافی ۱: ۶۹

[3] وسائل الشیعة ۲۷: ۱۲۳

[4] حوالہ سابق ۲۷: ۱۱۹۔ مصنف عبدالرزاق ۶: ۱۱۱ فما وافق کی جگہ ما واطی کے ساتھ۔ تہذیب تاریخ دمشق ۵: ۱۳۷ طبع شام

[5] اصول کافی ۱: ۹۵

سنت پر چھوڑ دیا۔ اسی لیے قرآن میں معاصر لوگوں میں سے کسی کا نام مذکور نہیں۔ نہ برگزیدہ ہستیوں کے نام مذکور ہیں نہ قابل مذمت لوگوں کے نام درج ہیں۔ صرف ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت نام لے کر کی گئی ہے، کیونکہ ابولہب کی کھلی عداوت اور خود حضور (ص) کا رشتہ دار ہونا ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اس کا نام صریحاً لیا گیا۔ کیونکہ مستقبل میں رسول (ص) کے خاندان کی طرف سے کسی تحریف کا خطرہ نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اصول وکلیات کی تشریح وتوضیح رسول خدا (ص) کے ذمہ کر دی تھی۔ مثلاً آیہ تطہیر میں اہل بیت (ع) کا نام نہیں لیا گیا۔ سنت رسول (ص) نے ایک ایک فرد کا تعارف کرایا۔

آیہ مباہلہ میں بھی اَبْنَآءَنَا اور نِسَآءَنَا سے جو لوگ مراد ہیں ان کی وضاحت سنت رسول (ص) نے کی۔

نیز سورۃ کوثر میں اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ میں یوں نہیں فرمایا: عاص بن وائل او امیة بن الخلف هو الابتر بلکہ رسول (ص) نے گستاخان رسول (ص) کی نشاندہی فرمائی۔

اگر قرآن میں یہ بتا دیا جاتا کہ... الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ [1] سے کون لوگ مراد ہیں تو بنی امیہ قرآن کے ساتھ کیا کچھ نہ کرتے۔

اسی طرح اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا [2] میں اس فاسق یعنی ولید بن عتبہ کا ذکر نہیں آیا جو بعد میں کوفے کا حاکم رہا اور جس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھائی اور محراب میں قے کی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ [3] جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں بلاشبہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔

میں بھی ان بیوقوفوں کا نام نہیں لیا گیا۔ ایسے تمام موارد میں قرآن کی مراد اور مقصود کا بیان کرنا سنت رسول اللہ (ص) کی ذمہ داری ہے۔ [4]

ہم اس کی کئی مثالیں سنت رسول (ص) سے بھی پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے:

اکثر مفسرین اور صحاح نے قرآن کی متعدد آیات کے بارے میں ان روایات کو نہایت شوق سے ذکر کیا ہے جن کے مطابق یہ آیات حضرت ابوطالب کے خلاف نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً سورہ برائت آیت ۱۱۳ اور سورہ قصص کی آیت کے بارے میں صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ القصص میں یہ روایت ملے گی کہ یہ دو آیتیں حضرت ابو طالب کے عدم ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، لیکن المائدہ کی آیت ۵۵ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ

---

[1] ۱۷ اسراء: ۶۰
[2] ۴۹ حجرات: ۶ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو۔
[3] ۴۹ حجرات: ۴
[4] اقتباس از انٹرویو آیۃ اللہ عسکری

اللّٰہُ ... کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی کہ یہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، جب کہ اس حدیث کو بارہ اصحاب رسول (ص) نے روایت کیا ہے۔

اس سلسلے میں تحریف حدیث کی سب سے روشن مثال یہ ہے کہ حدیث غدیر، جسے رسول اللہ (ص) نے ہزاروں کے مجمع میں بیان فرمایا اور نہایت نامساعد حالات کے باوجود یہ حدیث ایک سو دس (۱۱۰) اصحاب رسول (ص) کی روایت سے ہم تک پہنچی ہے، صحاح میں ایسی احادیث کے لیے کوئی جگہ نہیں مل سکی۔

**۲۔ تدریجی نزول:** قرآن کو ضیاع اور تحریف سے بچانے کے لیے دوسرا انتظام اس کا تدریجی نزول تھا۔ ایک متوسط حجم کی کتاب ۲۳ سالوں کی مدت میں تدریجاً نازل ہوتی رہی اور کتاب بھی ایسی جس کا انداز کلام دوسرے کلاموں سے مختلف ہے اور جس میں روح اور سماعت دونوں کی تسکین کا سامان ہے۔ آیات مختصر، باقافیہ اور مسجع ہیں۔ مثلاً:

وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ [1]

اور

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ [2]

یہ مختصر اور مقفی آیات حفظ کرنے کے لیے نہایت آسان ہیں۔ اس طرح قرآن کتابت کے ساتھ سینوں میں بھی محفوظ رہا۔

بعد میں مدنی زندگی میں لکھنے پڑھنے کے وسائل فراہم ہوئے تو آیات اور قرآنی سورتیں طولانی ہونا شروع ہوگئیں۔ تدریجی نزول کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہوا کہ قرآن نہایت آسانی کے ساتھ امت کے حوالے ہوگیا۔ یعنی جس طرح نزول قرآن تدریجی تھا، اس کی تعلیم اور امت کی طرف اس کی منتقلی بھی تدریجی تھی۔ جس روز نزول کا کام مکمل ہوا، اسی روز قرآن کی امت کی طرف منتقلی بھی مکمل ہوئی۔ چنانچہ جس مرحلے میں امت کی طرف قرآن کی منتقلی مکمل ہوئی اسے عرضہ اخیر (آخری بازخوانی) کہتے ہیں۔

**کتاب فصل الخطاب اور کتاب الفرقان:** مکتب امامیہ پر عائدالزام کی ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ان کے ایک جید عالم نے تحریف قرآن کے اثبات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور اس کا نام فصل الخطاب رکھا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے:

اولاً: ایسا واقعہ صرف امامیہ کے ہاں پیش نہیں آیا بلکہ مصر کے ایک جید عالم علامہ ابن الخطیب المصری نے ۱۹۴۷ء میں اسی قسم کی ایک کتاب تالیف کی جس میں ضعیف اور نادر روایات جمع کر کے قرآن کی تحریف و تبدیلی اور عدم صحت الفاظ پر بے شمار دلائل پیش کیے۔

اس کتاب کے بارے میں جامعۃ الازہر کے کلیۃ الشریعۃ کے استاد علامہ شیخ محمد مدنی لکھتے ہیں:

---

[1] ۹۳ ضحی: ۱ تا ۳ [2] ۵۵ رحمٰن: ۱ تا ۴

یہ کہنا کہ امامیہ قرآن میں کمی واقع ہونے کے قائل ہیں، معاذ اللہ درست نہیں ہے، بلکہ ان کے ہاں بھی کچھ روایات ایسی ملتی ہیں جیسے ہمارے ہاں ملتی ہیں۔ دونوں فرقوں کے اہل تحقیق اس قسم کی روایات کو مسترد کرتے ہیں۔ چنانچہ شیعہ امامیہ یا زیدیہ میں کوئی تحریف کا قائل نہیں ہے، جیسا کہ اہل سنت کے ہاں بھی کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے۔

ایسی روایات کا مشاہدہ کرنے کے لیے جنہیں ہم مکمل طور پر مسترد کرتے ہیں، علامہ سیوطی کی کتاب الاتقان کا مطالعہ کریں اور ایک مصری صاحب نے تو ۱۹۴۸ء میں ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام الفرقان رکھا۔ اس مؤلف نے اس کتاب کو غیر معتبر، غیروں کی داخل کردہ اور مردود السند روایات سے پر کیا ہے اور ان روایات کو اہل سنت کے ہی مصادر و مآخذ سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ جامعۃ الازہر نے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا اور اس کتاب کے فاسد اور باطل ہونے پر دلائل قائم کیے۔ چنانچہ حکومت نے اسے منظور کر لیا اور کتاب ضبط ہو گئی۔ مؤلف نے تاوان کے لیے دعویٰ دائر کیا تو عدالت نے اس کا یہ دعویٰ مسترد کر دیا۔ تو کیا اس کتاب کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل سنت قرآن کے تقدس کے منکر ہیں؟ اور نقص در قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں؟ صرف ایک روایت کی بنا پر؟ یا فلاں شخص کی تالیف کردہ کتاب کی بنا پر؟ شیعہ امامیہ کا حال بھی کچھ اسی طرح ہے۔[1]

ثانیاً: فصل الخطاب میں درج ساری روایات، شیعوں کی نہیں ہیں، بلکہ اس میں اہل سنت کی روایات بھی بکثرت درج ہیں، جنہیں علامہ مرتضیٰ عسکری نے ایک مستقل کتاب میں جدا کر کے واضح کیا ہے کہ کون کون سی روایات امامیہ یعنی شیعہ مصادر سے ہیں اور کون سی غیر امامیہ یعنی اہل سنت مصادر سے۔[2]

ثالثاً: یہ کتاب ان روایات پر مشتمل ہے جو اصول حدیث کے اعتبار سے بے بنیاد اور مردود ہیں۔ علماء امامیہ میں سے کوئی ایسا نہیں جو اسے مستند سمجھے۔ علماء نے اس کو کتب ضالہ میں شمار کیا ہے۔ اس کے راویوں میں:

۱۔ احمد بن محمد السیاری ہے جو کذاب، فاسد العقیدہ اور تناسخ ارواح کا قائل ہے۔ اس کی روایات سب سے زیادہ ہیں۔

۲۔ سہل بن زیاد

---

[1] رسالۃ الاسلام شمارہ ۴، صفحہ ۳۸۲ [2] العسکری: القرآن الکریم و روایات المدرستین۔ الکتاب الثالث

۳۔ ابراهیم بن اسحاق نهاوندی

۴۔حسین بن حمدان الحضبی

۵۔ ابو سمینه محمد بن علی الکوفی

اور

۶۔ محمد بن سلیمان الدیلمی

جیسے ضعیف و کذاب راوی شامل ہیں۔جن کی روایات کا کوئی علمی وزن نہیں ہے۔اسی لیے فصل الخطاب کے مؤلف کے معاصرین نے اس کتاب کی رد میں کئی ایک کتابیں لکھی ہیں مثلاً :

۱۔علامہ سید محمد حسین شہرستانی نے حفظ الکتاب الشریف عن شبهة القول بالتحریف لکھی۔

۲۔علامہ محقق شیخ محمود تہرانی نے کشف الارتیاب فی ردّ فصل الخطاب لکھی۔

# علوم القرآن

## سبقت ۔ خدمات

غریب القرآن۔قراءۃ القرآن۔ آیات الاحکام۔قرآن کے نقطے۔مجاز القرآن۔تفسیر القرآن۔عصر ائمہ (ع) کی تفاسیر۔ پہلی صدی کی تفاسیر۔ دوسری صدی کی تفاسیر۔ تیسری صدی کی تفاسیر۔ ناسخ اور منسوخ۔

ذیل میں ہم اس بات کو متفق علیہ مصادر سے واضح کریں گے کہ قرآن سے متعلق تقریباً تمام علوم کی تدوین وتصنیف میں فرزندان مکتب اہل بیت(ع) کو سبقت حاصل رہی ہے اور مختلف میدانوں میں آغاز انہی کی طرف سے ہوا ہے۔

باب مدینة العلم حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے علوم قرآن کی طرف امت قرآن کی رہنمائی فرمائی۔ چنانچہ آپ (ع) نے قرآن سے مربوط ساٹھ علوم کی تشریح فرمائی اور ہر علم کو مثال کے ساتھ بیان فرمایا۔ ان معارف کو کتاب کی شکل میں تدوین کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ مجلسی نے بحارالانوار کتاب القرآن میں پوری کتاب نقل کی ہے۔ اس کے بعد جتنی کتابیں علوم قرآن پر لکھی گئی ہیں، ان سب کا مأخذ یہی کتاب ہے۔

**غریب القرآن:** قرآن فہمی کے لیے سب سے پہلے تو مصدر وحی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات خود قرآن سے قرآن فہمی کے لیے مدد مل جاتی ہے۔ یعنی قرآن فہمی کے دو مصادر قرآن وسنت ہیں۔ اس کے بعد کسی لفظ کے لغوی معنی اور کسی محاورے کی تشریح عربوں کے محاورات اور استعمالات سے کی جاتی ہے جب کہ مشکل اور نادر (غریب) الفاظ کے معانی سمجھنے کے لیے عربوں کے اشعار سے مدد لی جاتی ہے۔ اس فن کو غریب القرآن کہا جاتا ہے۔

اس فن کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قرآن کے نادر الفاظ کے معانی کو سمجھنا خود اہل زبان کے لیے بھی مشکل تھا۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے آیت کریمہ: وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا [1] کا مفہوم سمجھنے سے عجز کا اظہار کیا نیز وہ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ [2] میں تَخَوُّفٍ کے معنی دوسروں سے پوچھتے تھے۔ [3]

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ دو اعرابی ایک کنویں کے سلسلے میں میرے پاس آئے اور ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتھا یعنی اس کنویں کو پہلی بار میں نے کھودا ہے۔ اس کی یہی بات سن کر فَاطِرِ کے معنی سمجھ میں آئے۔

---

[1] ۸۰ عبس: ۳۱ [2] ۱۶ نحل: ۴۷ [3] مقدمہ مفردات القرآن (اردو) از مولانا محمد عبدہ فیروزپوری۔

**غریب القرآن:** تالیف حضرت عبداللہ بن عباس (حبر امت)۔ آپ نے قرآن کے نادر اور مشکل الفاظ کے حل کے لیے ایک کتاب لکھی۔ واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ایک طرف سے تو حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد ہیں اور دوسری طرف حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے جلیل القدر صحابی ابونصر محمد بن سائب کلبی ان سے غریب القرآن کی روایت نقل کرتے ہیں۔

**غریب القرآن:** تالیف ابان بن تغلب الجریری (متوفی ۱۴۱ھ)۔ ائمہ اہل بیت (ع) کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے۔ آپ نے حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کا زمانہ پایا۔ حضرت ابن عباس کے بعد آپ اس فن کے پہلے مصنف ہیں۔ چنانچہ اس بات کی علامہ سیوطی نے بغیة الوعاظ میں تصریح کی ہے۔

شیخ الحدیث محمد عبدہ فیروز پوری مفردات القرآن (اردو) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

غریب القران کے سلسلے میں حضرت ابن عباس کے بعد ابان بن تغلب الجریری متوفی ۱۴۱ھ کا نام لیا جاتا ہے جو قاری و فقیہ ہونے کے علاوہ لغت کے بھی عظیم المرتبت عالم تھے اور علی بن حسین (امام سجاد) اور ابو عبد اللہ (امام صادق علیہم السلام) سے روایت کرتے تھے۔ استاد عطار لکھتے ہیں:... سمع من العرب و الف غریب القرآن و ذکر شوا هده من الشعر۔[1] (یعنی عربوں سے اخذ کیا۔ قرآن کے مشکل الفاظ کے بارے میں کتاب لکھی اور شعر سے شواہد ذکر کیے)

ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے۔ ابان گو تشیع میں غالی تھے یعنی علی (ع) کی تفضیل کے قائل تھے تاہم رافضی نہیں تھے نیز چونکہ روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔[2]

اس موضوع پر سب سے پہلی کاوش حضرت ابان بن تغلب کی طرف سے عمل میں آئی۔ ابن ندیم اپنی کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں:

و له من الکتب، کتاب معانی القرآن لطیف، کتاب القرائات. کتاب من الاصول فی الروایة علی مذهب الشیعة۔[3]

**قرائة القرآن:** علم قراءت پر اسلامی تاریخ میں سب سے پہلی کتاب حضرت ابان بن تغلب کی کتاب القراءات ہے۔ جیسا کہ ابن ندیم نے الفہرست میں ذکر کیا ہے۔

حضرت آیۃ اللہ سید حسن صدرؒ اپنی کتاب تاسیس الشیعة لعلوم الاسلام میں لکھتے ہیں:

حافظ ذہبی کا خیال ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ابو عبید قاسم بن سلام کی ہے، حالانکہ سب کے نزدیک ان کی وفات ۲۲۴ھ میں ہوئی ہے اور

---

[1] مقدمة الصحاح [2] مقدمہ مفردات القرآن (اردو) صفحہ ۱۶ معانی القرآن [3] الفہرست ابن الندیم۔ ص ۲۷۶

ابان بن تغلب کی وفات ان سے ۸۳ سال پہلے یعنی ۱۴۱ ہجری میں ہوئی ہے۔
جیسا کہ علامہ سیوطی نے طبقات النحاۃ میں اس بات کی تصریح کی ہے۔
شاید ذہبی کا مقصد یہ ہو کہ اہل سنت میں سے جس شخص نے سب سے پہلے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے وہ ابو عبید ہے، ورنہ اس موضوع پر سب سے پہلے لکھنے والا ابان بن تغلب ہے۔ ان کے بعد حمزہ بن حبیب کا نام آتا ہے جو سات مشہور قاریوں میں سے ایک ہیں اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ حمزہ کی وفات ۱۵۸ ھ میں ہوئی ہے۔ بنا بریں حمزہ ابو عبیدہ سے ۶۶ سال پہلے کے ہیں۔[1]

قرائة امیر المؤمنین(ع): تالیف حضرت زید شہید ۱۲۲ ھ۔

کتاب القرائة: تالیف ابو جعفر محمد بن سعدان الضریر متوفی ۲۳۱ ھ۔

کتاب القرائة: تالیف: ابو عثمان بکر بن محمد بن حبیب المازنی متوفی ۲۴۹ ھ۔

**آیات الاحکام:** قرآن مجید کی جو آیات حلال و حرام اور شرعی احکام سے مربوط ہیں انہیں آیات الاحکام کہتے ہیں۔

قرآن مجید کی تاریخ میں احکام سے مربوط آیات (آیات الاحکام) کو سب سے پہلے مرتب کرنے کا شرف بھی مذہب اہل بیت (ع) کے ایک پیرو کار کو حاصل ہے۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے شاگرد جناب ابو نصر محمد بن سائب بن بشر کلبی متوفی ۱۴۶ ہجری کی کتاب احکام القرآن اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔ آپ مفسر قرآن بھی ہیں۔ آپ کی تفسیر اس زمانے کی سب سے بڑی مفصل تفسیر ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

علامہ سیوطی کہتے ہیں: اس موضوع کے سب سے پہلے مصنف امام شافعی ہیں۔ حالانکہ امام شافعی کی ولادت ۱۵۵ ھ میں ابو نصر کلبی کی وفات کے نو سال بعد ہوئی ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ قاسم بن اصبغ بن محمد بن یوسف بیانی قرطبی اندلسی اس موضوع کے سب سے پہلے مصنف ہیں، حالانکہ ان کی ولادت بقول سیوطی ۲۴۷ ھ میں امام شافعی کی وفات کے ۴۳ سال بعد ہوئی ہے۔[2]

تفسیر آیات الاحکام۔ تالیف: ابو الحسن مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۰ ھ)۔ وہ امام جعفر صادق (ع) کے صحابی ہیں۔ اس کتاب کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست صفحہ ۲۵۴ میں کیا ہے۔ الذریعہ جلد ۴ صفحہ ۲۳۵ میں آقا بزرگ طہرانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] تاسیس الشیعة لعلوم الاسلام ص:۳۱۹ [2] الذریعة ۱: ۴۰

ابو نصر کلبی کے بعد ان کی کتاب اس موضوع کی دوسری کتاب ہے۔ کیونکہ ان کی وفات امام شافعی کی ولادت سے پانچ سال پہلے ہوئی ہے۔

متشابہ القرآن ۔ تالیف: حمزہ بن حبیب الزیات کوفی متوفی ۱۵۶ھ۔ آپ سات نامور قاریوں میں سے ایک ہیں۔ آپ نے قرائت حضرت امام جعفر صادق (ع) سے سیکھی۔ متشابہ القران کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔[1]

تقسیم القرآن ۔ تالیف: محمد بن سائب کلبی متوفی ۱۴۶ھ۔ آپ حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق (ع) کے شاگرد ہیں۔ کتاب کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں قرآنی موضوعات کی تقسیم بندی کی گئی ہوگی۔ اس طرح یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے۔

قرآن کے نقطے: شروع میں کتابت نقطوں کے بغیر ہوتی تھی۔ اس لیے صدر اسلام میں قرآن پڑھنے کے سلسلے میں صرف قرآنی نسخوں پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا بلکہ زیادہ تر استاد کی رہنمائی کا سہارا لیا جاتا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد حضرت ابوالاسود دؤلی نے سب سے پہلے حروف پر نقطے رکھے۔ ان کی اس عظیم خدمت سے قرآن مجید کے تلفظ میں غلطی کی گنجائش باقی نہ رہی۔

سیوطی نے مطالع السعیدۃ میں اور عبد الواحد ابو الطیب لغوی نے مراتب النحو یین میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ ابو الاسود دؤلی ہی نے سب سے پہلے حروف پر نقطے رکھے۔

بعض حضرات کے نزدیک سب سے پہلے ابو الاسود کے شاگرد یحیٰ بن یعمر نے حروف پر نقطے رکھے۔ اگرچہ یحیٰ بن یعمر بھی مذہب اہل بیت (ع) سے تعلق رکھتے تھے تاہم صحیح قول یہ ہے کہ یہ کام سب سے پہلے خود ابو الاسود نے ہی انجام دیا تھا۔

ابو الاسود کے شیعہ ہونے کی تصریح راغب اصفہانی نے المحاضرات میں، حافظ عسقلانی نے الاصابۃ میں، ابوالفرج اصفہانی نے الاغانی میں، یافعی نے مرآۃ الجنان میں، سیوطی نے الطبقات میں، ابن الانباری نے النزھۃ میں اور جاحظ وغیرہ نے کی ہے۔[2]

آل محمد (ص) کے فضائل میں جناب ابو الاسود کے یہ اشعار مشہور ہیں:

امفندی فی حب آل محمد
حجر بفیك فدع ملامك او زد

من لم یکن بحبالهم متمسکا
فلیعترف بولاء من لم یرشد[3]

---

[1] الذریعۃ ۴: ۱۷۳۔ [2] تاسیس الشیعۃ لعلوم الاسلام ص ۴۳ [3] ان اشعار کو زمخشری نے نقل کیا ہے

**مجاز القرآن:** اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب مذہب اہل بیت(ع) کے پیروکار فراء یحییٰ بن زیاد بن عبد اللّٰہ الدیلمی الکوفی (متوفی ۲۰۷ھ) نے لکھی۔ آپ علم نحو میں ایک نہایت ہی بلند مقام رکھتے ہیں۔

**الرغیب فی علوم القرآن۔** تالیف: ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۲۱۷ھ)۔ حضرت علی(ع) کے بعد علوم قرآن پر لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔[1]

**اعراب القرآن۔** تالیف: ابوجعفر محمد بن ابی وسادہ کوفی۔ ان کی وفات حضرت امام جعفر صادق (ع) کی حیات میں ۱۴۸ھ سے قبل ہوئی۔

**تفسیر القرآن:** کتب آسمانی میں کسی کتاب کو وہ توجہ اور اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو قرآن کو حاصل ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔

مکتب اہل بیت (ع) کے فرزندوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ تفسیر قرآن لکھنے میں سب سے پہلا قدم انہوں نے اٹھایا۔

**تفسیر میثم تمار:** تالیف میثم بن یحییٰ التمار الکوفی الشہید۔ آپ کی تفسیر کا ماخذ حضرت علی(ع) ہیں۔ آپ کو ۶۰ھ میں ابن مرجانہ کے حکم سے ہاتھ پاؤں اور زبان کاٹ کر سولی پر چڑھایا گیا۔

حضرت میثم تمارؓ نے اپنی تفسیر حضرت ابن عباس کو املا فرمائی۔ بعد میں جب ابن مرجانہ کے ہاتھوں اپنی شہادت کی پیشینگوئی سنائی تو ابن عباس نے اسے کہاوت سمجھ کر ان سے اخذ کردہ تفسیر کو پھاڑنے کا ارادہ کیا۔ تب حضرت میثم نے کہا: جو کچھ آپ نے مجھ سے سنا ہے، اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ اگر میری باتیں سچ ثابت ہوئیں تو اس تفسیر سے متمسک رہیں ورنہ بے شک اسے پھاڑ دیں۔ چنانچہ چند دنوں بعد وہی ہوا جس کی جناب میثم تمار نے پیش گوئی کی تھی۔[2]

**تفسیر جبیر:** تالیف حضرت سعید بن جبیر شہید۔ تاریخ قرآن میں آپ وہ پہلے مفسر ہیں جنہوں نے باقاعدہ قرآن کی تفسیر تالیف و تصنیف فرمائی۔ آپ حضرت امام زین العابدین (ع) کے جلیل القدر صحابی اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ممدوح ہیں۔ چنانچہ علامہ ابوعمرو کشی اپنی کتاب رجال میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| سعید بن جبیر کان یأتم بعلی بن الحسین و کان علی بن الحسین | سعید بن جبیر، علی ابن الحسین علیہما السلام کی امامت کے قائل تھے اور علی ابن الحسین علیہ السلام ان کی تعریف |

---
[1] الذریعہ ۴: ۲۷۲ [2] الذریعۃ ۴: ۳۱۷

یثنی علیه ۔ کرتے تھے ۔

ابن ندیم نے اپنی کتاب میں آپ کی تفسیر کا ذکر کیا ہے ۔

علامہ سیوطی الاتقان میں قتادہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

تابعین میں سب سے زیادہ عالم چار افراد تھے : عطاابن ابی ریاح مناسک و عبادات میں، سعید بن جبیر تفسیر میں، عکرمہ سیرت میں اور حسن حلال و حرام میں۔[1]

آپ کو حجاج نے تشیع کے جرم میں شہید کیا ۔

**عصر ائمہ (ع) کی تفاسیر:** صدر اسلام سے ہی قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں فرزندان مکتب اہل بیت (ع) کی قرآنی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل میں ہم عصر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی چند اہم تفاسیر کا ذکر کرتے ہیں۔ ان تفاسیر کے مطالعے سے جہاں قرآنی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب اہل بیت علیہم السلام کس قدر تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔

## پہلی صدی کی تفاسیر:

۱۔ تفسیر علی علیه السلام: شیخ مفید علیہ الرحمہ الارشاد میں فرماتے ہیں:

ان علیا قدم فی مصحفه المنسوخ علی الناسخ و کتب فیه تاویل بعض الآیات و تفسیر ها بالتفصیل۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے مصحف میں منسوخ کو ناسخ پر مقدم رکھا ہے اور اس میں بعض آیات کی تاویل اور ان کی تفسیر تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔

ابن سیرین کہتے ہیں:

لو اصبت ذلك الكتاب لكان فيه العلم ۔[2] کاش اس کتاب تک رسائی ہوتی تو علم کا خزانہ مل جاتا۔

محمد بن سیرین عکرمہ سے نقل کرتے ہیں:

لو اجتمعت الانس والجن علی ان یؤلفوا هذا التالیف ما استطاعوا۔[3] اگر اس قسم کی کتاب لکھنے کے لیے جن و انس جمع ہو جائیں تو بھی وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہوں گے ۔

۲۔ تفسیر ابن عباس: حضرت عبداللہ بن عباس حبر امت یعنی ''امت کے بلند پایہ عالم'' کے لقب سے ملقب ہیں۔

۳۔ تفسیر میثم تمار: تالیف میثم بن یحییٰ بن تمار الکوفی شہید (۶۰ ھ)۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ۲: ۱۹۰ [2] الطبقات الکبری ۲:۳۸۸ [3] الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۷

۴۔ تفسیر جبیر: تالیف حضرت سعید بن جبیر شہید۔

## دوسری صدی کی تفاسیر:

۵۔ تفسیر طاؤس: تالیف ابوعبداللہ طاؤس بن کیسان الیمانی (متوفی ۱۰۶ھ)۔ آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ احمد بن تیمیہ نے انہیں علم تفسیر میں سب سے زیادہ عالم قرار دیا ہے۔[1] آپ مستجاب الدعوات تھے۔

۶۔ تفسیر عطیہ: تالیف عطیہ عوفی (متوفی ۱۱۴ھ) آپ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ حضرت ابان بن تغلب ان سے روایت اخذ کرتے ہیں۔

۷ تفسیر جعفی: تالیف جابر جعفی تابعی (متوفی ۱۲۷ ھ) آپ حضرت امام محمد باقر (ع) کے خاص اور نہایت قریبی صحابی ہیں۔

حضرت آیۃ اللہ سید حسن صدر فرماتے ہیں:

و صنف تفسیر القرآن و کتبه عن الامام ابی جعفر الباقر علیه السلام — انہوں نے تفسیر لکھی اور اسے امام محمد باقر علیہ السلام سے اخذ کیا۔

آپ نے لمبی عمر پانے کے بعد ۱۲۷ ھ میں وفات پائی۔

۸۔ تفسیر سدی: تالیف ابومحمد اسماعیل بن عبدالرحمٰن الکوفی القرشی السدی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے:

امثل التفاسیر تفسیر اسماعیل السدی۔ — تفسیروں میں سب سے عمدہ تفسیر اسماعیل سدی کی ہے۔

آپ کی تفسیر کے راوی ابراہیم بن حکم بن ظہیر انفزاری ہیں۔

۹۔ تفسیر عدوی: تالیف زید بن اسلم عدوی (متوفی ۱۳۶ھ)۔ شیخ طوسی نے انہیں اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں شمار کیا ہے۔

اور ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں ان کی متعدد تفاسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ تفسیر ابن ابی ھند: تالیف داؤد بن دینار سرخسی (متوفی ۱۳۹ھ)۔ آپ حضرت امام باقر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ تفسیر ابی بصیر: تالیف: ابوبصیر یحییٰ بن قاسم اسدی (متوفی قبل ۱۴۸ھ)۔ آپ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے معتمد صحابی تھے۔ آپ علمی و فقہی اعتبار سے بلند مقام

---

[1] الاتقان از تاسیس الشیعة ص ۳۲۵

رکھتے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

**۱۲۔ تفسیر ثمالی:** حضرت ابوحمزہ ثابت بن دینا رکوفی ثمالی (متوفی ۱۵۰ھ) آپ حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام صادق علیہم السلام کے خاص صحابی تھے۔ اپنے عہد میں ائمہ اطہار علیہم السلام کے بعد رئیس شیعہ تھے۔

ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں، ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نیز نجاشی اور صاحب کشف الظنون نے بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

**۱۳۔ تفسیر مقاتل:** تالیف ابوالحسن مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۰ھ)۔ وہ حضرت امام جعفر صادق(ع) کے صحابی تھے۔

یافعی نے امام شافعی سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا:

| | |
|---|---|
| ان الناس کلھم عیال مقاتل بن سلیمان فی التفسیر۔[1] | تمام لوگ تفسیر کے سلسلے میں مقاتل بن سلیمان کے خوشہ چین ہیں۔ |

ان کی دیگر تالیفات یہ ہیں: الناسخ و المنسوخ۔ نوا در التفسیر۔ کتاب الجوابات فی القرآن۔ الآیات المتشابہات و متشابہ القرآن۔

**۱۴۔ تفسیر ابی الجارود:** تالیف ابوالجارود زیاد بن منذر (متوفی ۱۵۰ھ) یہ مادر زاد نابینا تھے اور حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کے صحابی تھے۔[2]

**۱۵۔ تفسیر بطاینی:** تالیف علی بن ابی حمزہ سالم بطاینی کوفی۔ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسی کاظم علیہ السلام کے صحابی تھے۔ وہ اپنی تفسیر میں ابوبصیر سے روایت اخذ کرتے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی اور الذریعہ نے کیا ہے۔

**۱۶۔ تفسیر ھشام کلبی:** تالیف ہشام بن محمد بن سائب کلبی۔ ان کے والد متوفی ۱۴۶ھ کی تفسیر کا پہلے ذکر ہو چکا۔ ہشام کی متعدد تفاسیر کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں اور آقا بزرگ نے الذریعہ میں کیا ہے۔

**۱۷۔ تفسیر اسماعیل:** تالیف اسماعیل بن زیاد شعیری کوفی۔ شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے ان کو اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں ذکر کیا ہے۔، ابن ندیم نے ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

**۱۸۔ تفسیر الجرحی:** تالیف ابو وہیب بن حفص الجریری۔ وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ثقہ صحابی تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر الذریعہ نے کیا ہے۔

---

[1] الذریعۃ ۴: ۳۱۶ [2] حوالہ سابق ۴: ۲۵۱

۱۹۔ تفسیر الجوالیقی: تالیف ہشام بن سالم جوالیقی ۔حضرت امام جعفر صادق اورحضرت امام موسی کاظم علیہا السلام کے صحابی ہیں۔نجاشی کے مطابق وہ ثقہ ہیں۔ان کی تفسیر کا ذکرالذریعۃ میں کیا گیا ہے۔

۲۰۔ تفسیر سلولی: تالیف حصین بن مخارق بن عبدالرحمٰن ورقہ ابو جنادہ سلولی متوفی ۲۰۰ ھ ان کے جد اعلیٰ کا نام حبشی تھا اوروہ صحابی رسول(ص) تھے ۔ وہ خود امام جعفر صادق اور امام موسی کاظم علیہا السلام کے صحابی ہیں۔ان کی تفسیر کا ذکرنجاشی اور ابن ندیم دونوں نے کیا ہے۔

۲۱۔ تفسیر ابی روق: تالیف عطیہ بن حارث ہمدانی کوفی تابعی( متوفی ۲۰۰ ھ) ان کی تفسیر کا ذکرابن ندیم،نجاشی اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے۔

۲۲۔ تفسیر واقد: تالیف حسن بن واقد (متوفی ۲۰۰ھ) ان کی تفسیر کا ذکرابن ندیم اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے۔

۲۳۔ تفسیر الحسین: تالیف حسین بن سعید بن حماد اہوازی کوفی (متوفی ۲۰۰ھ)۔آپ امام رضا اور امام محمد تقی علیہا السلام سے روایت نقل کرتے تھے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں ان کی تفسیر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک درجن دیگر تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

۲۴۔ التنزیل و کتاب التفسیر: تالیف ابوعبداللہ محمد بن خالد بن عبدالرحمٰن برقی ۔ وہ امام موسیٰ کاظم ، امام رضا اور امام محمد تقی علیہم السلام کے شاگرد تھے ۔شیخ طوسی نے اپنی الفہرست میں اور علامہ حلی نے اپنی کتاب الخلاصہ میں ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے ۔

۲۵۔ تفسیر منخل: تالیف منخل بن جمیل اسدی کوفی ( متوفی ۲۰۰ھ) وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکرنجاشی نے کیا ہے ۔ واضح رہے اسی مقدمہ کے صفحہ ۱۶۶ پر اس کے فاسد الروایۃ ہونے کا ذکر ہو چکا ہے ۔

۲۶۔ تفسیر الصلت: تالیف عبد اللّٰہ بن صلت تیمی قمی ۔ وہ سنہ ۲۰۰ ھ تک زندہ تھے۔وہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کرتے تھے اورحضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے وکیل تھے۔ان کی تفسیر کا ذکرنجاشی اورصاحب الذریعہ نے کیا ہے ۔

۲۷۔ تفسیر اسباط: تالیف ابوالحسن علی بن اسباط بن سالم کوفی (متوفی ۲۰۰ھ) حضرت امام رضا (ع) کے صحابی تھے اورنجاشی ان کے حق میں لکھتے ہیں: کان اوثق الناس و اصدقھم لھجۃ۔[1]

۲۸۔ تفسیر اھل البیت: تالیف ابو الفضل سلمۃ القمی ۔ وہ حضرت امام رضا اورحضرت امام محمد تقی علیہا السلام کے دور کے علماء میں سے تھے۔ان کی تفسیر کا ذکرنجاشی نے کیا ہے۔

---

[1] حوالہ سابق ۴: ۲۴۰

## تیسری صدی کی تفاسیر:

**۲۹۔ تفسیر یونس:** تالیف یونس بن عبدالرحمٰن (متوفی ۲۰۸ھ) انہوں نے صفا و مروہ کے درمیان امام جعفر صادق علیہ السلام کی زیارت کی۔ وہ حضرت امام موسیٰ کاظم اور حضرت امام رضا علیہا السلام سے روایت کرتے تھے۔ وہ نہایت جلیل القدر عالم تھے۔

**۳۰۔ تفسیر ھمام:** تالیف عبدالرزاق بن ہمام بن نافع حمیری یمانی صنعانی متوفی ۲۱۱ ھ۔ وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے جلیل القدر صحابی اور بلند پایہ عالم تھے۔ ان کی یہ تفسیر مصر کے بعض کتب خانوں میں آج تک محفوظ ہے۔[1]

**۳۱۔ تفسیر محبوب:** تالیف ابوالحسن بن محبوب سراد (متوفی ۲۲۴ھ)۔ وہ حضرت امام رضااور امام محمد تقی علیہا السلام کے صحابی ہیں اور حضرت امام صادق (ع) کے ساٹھ اصحاب سے روایت اخذ کرتے ہیں۔ آپ نہایت ہی جلیل القدر عالم تھے۔

**۳۲۔ تفسیر مہزیار:** تالیف ابوالحسن علی بن مہزیار دورقی (متوفی ۲۲۹ ھ)۔ وہ حضرت امام رضا، حضرت امام محمد تقی اور حضرت علی نقی علیہم السلام کے وکیل رہے ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف حروف القرآن بھی ہے۔

**۳۳۔ تفسیر دکین:** تالیف فضل بن دکین شہید (متوفی ۲۱۹ھ)۔ ان کی تفسیر کا ذکر آیۃ اللہ سید حسن صدر نے اپنی کتاب تاسیس الشیعہ میں کیا ہے۔

**۳۴۔ تفسیر فضال:** تالیف ابومحمد حسن بن علی بن فضال کوفی (متوفی ۲۲۴ھ)۔ ان کی تفسیر کا ذکر آیۃ اللہ سید حسن صدر اور ابن ندیم نے کیا ہے۔

**۳۵۔ تفسیر الفراء:** تالیف یحییٰ بن زیاد اقطع بن عبداللہ دیلمی (متوفی ۲۰۷ھ)۔ ان کے والد کا ہاتھ واقعہ فخ میں کٹ گیا تھا اس لیے ان کو اقطع کہتے تھے۔ ان کی تفسیر اور دیگر متعدد تصانیف کا ذکر ابن ندیم نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

**۳۶۔ تفسیر العسکری:** تالیف ابوعلی حسن بن خالد بن عبدالرحمٰن برقی۔ ابن شہر آشوب اور صاحب الذریعہ نے اس تفسیر کا ذکر تفسیر العسکری کے نام سے اس لیے کیا ہے کہ یہ پوری تفسیر حضرت امام علی نقی (ع) کی املا کردہ ہے۔ حضرت امام علی نقی (ع) کو بھی صاحب عسکر یا عسکری کہتے ہیں۔ یہ تفسیر ایک سو بیس جلدوں پر مشتمل تھی لیکن اس کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

**ناسخ اور منسوخ:** اس نہایت اہمیت کے حامل موضوع پر مذہب اہل بیت (ع) کے فرزندوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں ہم بطور نمونہ چند اہم کتابوں کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو اس

---

[1] حوالہ سابق ۴: ۲۵۰

موضوع پر عصر ائمہ اہل بیت علیہم السلام میں تالیف ہوئیں۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف حسن بن علی بن فضال فطحی کوفی (متوفی ۲۲۴ھ)۔ نجاشی اور صاحب الذریعہ نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف ابوجعفر احمد بن محمد بن عیسی اشعری قمی۔ انہوں نے امام رضا علیہ السلام کی زیارت کی اور حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ اس کتاب کا نجاشی اور صاحب الذریعہ نے ذکر کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف حسن بن واقد (متوفی ۲۰۰ھ)۔ اس کتاب کا ذکر ابن ندیم اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف دارم بن قبیصہ بن نهشل تمیمی دارمی۔ وہ امام رضا علیہ السلام کے صحابی تھے۔ اس کتاب کا ذکر نجاشی اور صاحب الذریعة نے کیا ہے۔

الناسخ و المنسوخ: تالیف عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن الاصم السمعی البصری۔ آپ حضرت امام جعفر صادق (ع) کے صحابی مسمع کردیز سے روایت اخذ کرتے ہیں۔ اس کتاب کا ذکر نجاشی اور صاحب الذریعة نے کیا ہے۔